Registered No. L. 4186

رمضان ۱۳۵۸ھ — جلد ۱۵ – عدد ۳

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبۂ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن" - لاہور

مبارک پارک ۔ پونچھ روڈ

قیمت سالانہ صر — قیمت فی پرچہ ۵ر

رسالہ ترجمان القرآن ماہوار

مرتبہ

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

تمام ہندوستان میں یہ اپنی نوعیت کا ایک ہی ماہوار رسالہ ہے۔ اس کا مقصد وحید اعلائے کلمۃ اللہ اور دعوت جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ دُنیا میں جو افکار و تخیلات اور اصولِ تہذیب و تمدّن پھیل رہے ہیں، اُن پر قرآنی نقطۂ نظر سے تنقید کرنا اور فلسفہ و سائنس، سیاست و معیشت، تمدّن و معاشرت ہر چیز میں قرآن و سُنّت کے پیش کردہ اصولوں کی تشریح کرنا اور زمانۂ جدید کے حالات پر اِن اصُولوں کو منطبق کرنا اس رسالہ کا خاص موضوع ہے۔

یہ رسالہ امت مسلمہ کو ایک نئی زندگی کی دعوت دیتا ہے اور اسکی دعوت کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

"اپنے دل اور دماغ کو مُسلمان بناؤ۔ جاہلیت کے طریقے چھوڑ کر اسلام کی صراط مستقیم پر چلو۔ قرآن کو لے کر اُٹھو اور دُنیا میں غالب بن کر رہو"۔

یہ رسالہ سات سال سے باقاعدہ نکل رہا ہے اور ملک کے مشہور رسالوں کی صفِ اوّل میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ قیمت سالانہ پانچ روپے۔ نمونے کا پرچہ ۸/

مینجر رسالہ "ترجمان القرآن" لاہور

صرف سرور کی پرنٹنگ پریس نسبت روڈ لاہور میں طبع ہوا

فہرست مضامین

ماہ رمضان ۱۳۵۸ھ (نومبر ۱۹۳۹ء) - جلد ۱۵ - عدد ۳

باہتمام ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر گیلانی الیکٹرک پریس، ہسپتال روڈ لاہور میں طبع ہو کر دفتر ترجمان القرآن پونچھ روڈ، مبارک پارک سے شائع ہوا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

دنیا میں جب کوئی تحریک کسی اخلاقی یا اجتماعی یا سیاسی مقصد کو لیکر اٹھتی ہے تو اسکی طرف وہی لوگ رجوع کرتے ہیں جنکے ذہن کو اس تحریک کے مقاصد اور اسکے اصول اپیل کرتے ہیں، جنکی طبیعتیں اُس کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہیں، جنکے دل گواہی دیتے ہیں کہ یہ تحریک صحیح اور معقول ہے، اور جو اپنے نفس کی پوری آمادگی کے ساتھ اُس کو چلانے اور دنیا میں قائم کرنے کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔ اُن کے سوا باقی تمام لوگ جنکی طبیعت کی اُفتاد اُس تحریک کے مقاصد اور اصولوں سے مختلف ہوتی ہے، پہلے ہی اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اُس کے دائرے میں آنے والے لائے نہیں جاتے بلکہ خود آتے ہیں۔ انہیں کوئی چیز مجبور کر کے خواہ مخواہ اُس میں داخل نہیں کر دیتی۔ نہ کوئی طاقت انہیں لاکر اس طرح اُس میں چھوڑ جاتی ہے جیسے کوئی کسی اندھے کو جنگل میں لے جاکر چھوڑ دے اور اسے کچھ پتہ نہ ہو کہ میں کہاں ہوں اور کس لیے لایا گیا ہوں۔ بلکہ وہ اسے جانچ کر، پرکھ کر، سمجھ کر پورے شعور اور کامل قصد کے ساتھ آتے ہیں۔ اور جب آجاتے ہیں تو اُس کے مقصد کو اپنا مقصد بنا کر کام کرتے ہیں کیونکہ وہی مقصد ان کے دل و دماغ کو اپیل کرتا ہے۔ اس کے اصولوں کو اپنے اصول بنا کر چلتے ہیں کیونکہ ان اصولوں کو صحیح و برحق سمجھ کر ہی وہ اس میں داخل ہوتے ہیں۔ ان کے لیے اس تحریک کو چلانا زندگی کا مشن بن جاتا ہے کیونکہ جو چیز اُن سے اُن کا پچھلا مسلک و مشرب چھڑاتی ہے اور اُن کو اس نئے مسلک کی طرف کھینچ کر لاتی ہے وہ دراصل ان کے قلب و روح کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ یہی مسلک حق اور راست ہے۔ دراصل اس تحریک میں ان

پر حق منکشف ہوتا ہے۔ اس کا انکشاف ہی انکو اس تحریک کی طرف کھینچتا ہے۔ اور انکشاف حق کی خاصیت یہ ہے کہ وہ آدمی کو کبھی اُس مقام پر نہیں ٹھیرنے دیتا جہاں وہ اُس انکشاف سے پہلے ہوتا ہے، بلکہ وہ اسے کشاں کشاں اُس مقام کی طرف کھینچ لے جاتا ہے جدھر حق کی روشنی اسے نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ کسی تحریک کی صداقت کے معترف ہو کر اسے قبول کرتے ہیں انکی زندگیوں کا رنگ بدل جاتا ہے وہ پہلے سے بالکل مختلف ہو جاتے ہیں۔ ان سے ایسی باتوں کا ظہور ہوتا ہے جن کی توقع عام حالات میں انسان سے نہیں کی جاتی۔ وہ اپنے اصولوں کی خاطر دوستیوں اور خونی و قلبی رشتوں تک کو قربان کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے کاروبار، اپنی پوزیشن، اپنے منافع اور اپنی ہر چیز کا نقصان گوارا کرتے ہیں، حتیٰ کہ قید و بند کی تکالیف اور موت کے خطرات تک سہنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ انقلاب ایسا ہمہ گیر ہوتا ہے کہ ان کی عادات بدل جاتی ہیں، انکے خصائل میں تغیر آجاتا ہے، یہاں تک کہ ان کے لباس، خوراک اور عام طرز زندگی پر بھی اس کے اثرات ایسے نمایاں ہوتے ہیں کہ گرد و پیش کے لوگوں میں وہ اپنی ہر ادا سے الگ پہچان لیے جاتے ہیں۔ ہر شخص ان کو دیکھ کر کہہ دیتا ہے کہ وہ جا رہے ہیں فلاں تحریک کے حامی۔

ہر تحریک کی ابتدا یوں ہی ہوتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں سے وہ جماعت بنتی ہے جو اسے چلانے کے لیے اٹھتی ہے۔ اس کے مقاصد اور اس کے اصول خود ہی آدمیوں کی اُس بھیڑ میں سے، جو دنیا میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے، اپنے مطلب کے آدمی چھانٹتے ہیں، اور صرف انہی لوگوں کو اس تحریک کے دائرے میں لاتے ہیں جنہیں اس سے مناسبت ہوتی ہے۔

اس کے بعد ایک دوسرا دور آتا ہے۔ جو لوگ اس تحریک میں شامل ہوتے ہیں انکی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ انکی اولاد بھی اسی مسلک پر اٹھے جسکو خود انہوں نے حق پاکر قبول کیا ہے۔ اس غرض کے لیے وہ اپنی نئی نسلوں پر تعلیم، تربیت، گھر کی زندگی اور باہر کے ماحول سے اس قسم کے اثرات ڈالنے کی کوشش

کرتے ہیں کہ انکے خیالات، اخلاق، عادات اور خصائل سب کے سب اس مسلک کی روح اور اسکے اصول کے مطابق ڈھل جائیں۔ اس میں انہیں ایک حد تک کامیابی ہوتی ہے، مگر بس ایک حد تک ہی ہوتی ہے پوری کامیابی ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیم و تربیت اور سوسائیٹی کے ماحول اور خاندانی روایات کو طبائع کے ڈھالنے میں بہت کچھ دخل حاصل ہے، مگر فطرت، دماغ کی ساخت، مزاج کی پیدائشی افتاد بھی ایک اہم چیز ہے، اور حقیقت میں دیکھا جائے تو بنیادی چیز یہی ہے۔ فطری طور پر دنیا میں ہر قسم کے آدمی ہر مزاج، ہر رجحان، ہر ساخت کے آدمی ہمیشہ پیدا ہوتے ہیں۔ جسطرح اس تحریک کے ظہور کے وقت ہر طرح کے آدمی دنیا میں موجود تھے، اور اُن سب نے اسکو قبول نہیں کر لیا تھا بلکہ صرف وہی اس کی طرف کھنچے تھے جو اس سے ذہنی مناسبت رکھتے تھے، اسی طرح بعد میں بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ سب لوگ جو اس تحریک کے حامیوں کی نسل سے پیدا ہونگے انہیں لامحالہ اس تحریک سے مناسبت ہی ہوگی۔ اُن میں ابوجہل اور ابولہب بھی ہونگے عمرؓ اور خالدؓ بھی ہونگے۔ اور ابوبکرؓ بھی ہونگے۔ جسطرح آزر کے گھر میں ابراہیم حنیف پیدا ہوسکتا ہے اُسی طرح نوحؑ کے گھر میں عمل غیر صالح بھی پیدا ہوسکتا ہے اور ہوا ہے۔ قانون فطرت کے مطابق یہ لازمی امر ہے کہ اس سوسائیٹی سے باہر بہت سے آدمی ایسے پیدا ہوں جو اپنے مزاج کی افتاد اور اپنے پیدائشی رجحان کے لحاظ سے اسکے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں، اور خود اسکے اندر بہت سے آدمی ایسے پیدا ہوں جو اسکے ساتھ کوئی مناسبت نہ رکھتے ہوں۔ پس یہ ضروری نہیں کہ تعلیم و تربیت کا وہ نظام جو تحریک کے ابتدائی حامی اپنی آئندہ نسلوں کے لیے قائم کرتے ہیں وہ انکی پوری نئی پود کو انکے مسلک کا حقیقی متبع بنادے۔

اس خطرے کے سدِباب، اور تحریک کو اس کے بنیادی اصولوں پر برقرار رکھنے کے لیے دو صورتیں اختیار کی جاتی ہیں:

ایک یہ کہ جو لوگ تعلیم و تربیت اور اجتماعی ماحول کی تاثیرات کے باوجود ناکارہ نکلیں ان کو جماعت سے

خارج کردیا جائے، اور اس طرح جماعت کو غیر مناسب عناصر سے پاک کیا جاتا رہے۔

دوسرے یہ کہ تبلیغ کے ذریعہ سے جماعت میں اُن نئے لوگوں کی بھرتی کا سلسلہ جاری رہے جو رجحان و ذہنیت کے اعتبار سے اس تحریک کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں، اور جن کو اس کے اصول و مقاصد اُسی طرح اپیل کریں جس طرح ابتدائی پیروؤں کو انہوں نے اپیل کیا تھا۔

یہ اور صرف یہی دو صورتیں ایسی ہیں جو کسی تحریک کو زوال سے اور کسی جماعت یا پارٹی کو انحطاط سے بچا سکتی ہیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ رفتہ رفتہ لوگ ان دونوں تدبیروں کی اہمیت سے غافل ہوتے جاتے ہیں۔ جماعت کے باہر سے نئے لوگوں کو اندر لانے کی کوشش کم ہونے لگتی ہے۔ جماعت کی افزائش کے لیے تمام تر نسلی افزائش ہی پر اعتماد کر لیا جاتا ہے۔ اور جو لوگ اس طرح جماعت کے اندر پیدا ہوتے ہیں ان میں سے ناکارہ لوگوں کو خارج کرنے میں خونی رشتوں اور معاشرتی تعلقات اور دنیوی مصلحتوں کی خاطر تساہل برتا جاتا ہے۔ طرح طرح کے بہانوں سے جماعتی مسلک میں ایسی گنجائشیں نکالی جاتی ہیں کہ ہر قسم کے رطب و یابس اُس میں سما سکیں۔ اور اس مسلک کو اتنا وسیع کر دیا جاتا ہے کہ سرے سے اس کے سرحدی نشانات اور امتیازی حدود باقی ہی نہیں رہتے۔ یہاں تک کہ بھانت بھانت کے آدمی اس جماعت کے دائرے میں جمع ہو جاتے ہیں جن کو کسی قسم کی مناسبت اس کے مسلک سے، اس کے اصولوں سے اور اس کے مقاصد سے نہیں ہوتی۔

پھر جب جماعت میں اس کے اصولوں سے حقیقی مناسبت رکھنے والے کم اور مناسبت نہ رکھنے والے زیادہ ہو جاتے ہیں تو اجتماعی ماحول اور تعلیم و تربیت کا نظام بھی بگڑنے لگتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر نئی نسل پہلے کی نسل سے بدتر اٹھتی ہے۔ جماعت کا قدم روز بروز تنزل و انحطاط کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اُس مسلک کا اور اُن اصول و مقاصد کا تصور بالکل ہی ناپید

ہو جاتا ہے جن پر ابتدا میں وہ جماعت بنی تھی۔ اس مقام پر پہنچ کر حقیقت میں جماعت ختم ہو جاتی ہے اور محض ایک نسلی اور معاشرتی قومیت اسکی جگہ لے لیتی ہے۔ وہ نام جو ابتدا میں ایک تحریک کے علمبرداروں کے لیے بولا جاتا تھا، اسکو وہ لوگ استعمال کرنے لگتے ہیں جو اس تحریک کو مٹانے والے اور اسکے جھنڈے کو سرنگوں کرنے والے ہوتے ہیں۔ وہ نام جو ایک مقصد اور ایک اصول کے ساتھ وابستہ تھا، وہ باپ سے بیٹے کو ورثہ میں ملنے لگتا ہے بلا لحاظ اسکے کہ صاحب زادے کی زندگی کے اصول اور مقاصد اس نام سے کوئی دور کی مناسبت بھی نہ رکھتے ہوں۔ درحقیقت ان لوگوں کے ہاتھ میں پہنچ کر وہ نام اپنی معنویت کھو دیتا ہے۔ وہ خود بھول جاتے ہیں اور دنیا بھی بھول جاتی ہے کہ یہ نام کسی مقصد، کسی مسلک، کسی اصول کے ساتھ وابستہ ہے۔ بے معنی و مفہوم نہیں ہے۔

اسلام اس وقت اسی آخری مرحلہ میں پہنچ چکا ہے۔ مسلمان کے نام سے جو قوم اس وقت موجود ہے وہ خود بھی اس حقیقت کو بھول گئی ہے، اور اسکے طرز عمل نے دنیا کو بھی یہ بات بھلا دی ہے کہ اسلام اصل میں ایک تحریک کا نام ہے جو دنیا میں ایک مقصد اور ایک اصول کو لے کر اٹھی تھی، اور مسلمان کا لفظ اُس جماعت کے لیے وضع کیا گیا تھا جو اس تحریک کی پیروی اور اسکی علمبرداری کے لیے بنائی گئی تھی۔ تحریک گُم ہو گئی اسکا مقصد فراموش کر دیا گیا۔ اسکے اصولوں کو ایک ایک کر کے توڑ ڈالا گیا۔ اور اس کا نام اپنی تمام معنویت کھو دینے کے بعد اب محض ایک نسلی و معاشرتی قومیت کے نام کی حیثیت سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ حد یہ ہے کہ اسے ان مواقع پر بھی بے تکلف استعمال کیا جاتا ہے جہاں اسلام کا مقصد پامال ہوتا ہے، جہاں اس کے اصول توڑے جاتے ہیں، جہاں اسلام کے بجائے غیر اسلام ہوتا ہے۔

بازاروں میں جائیے "مسلمان رنڈیاں" آپ کو کوٹھوں پر بیٹھی نظر آئینگی اور "مسلمان زانی"

گشت لگاتے ملینگے۔ جیلخانوں کا معائنہ کیجیے، "مسلمان چوروں"، "مسلمان ڈاکوؤں"، اور "مسلمان بدمعاشوں" سے آپ کا تعارف ہوگا۔ دفتروں اور عدالتوں کے چکر لگائیے۔ رشوت خواری، جھوٹی شہادت، جعل، فریب، ظلم اور ہر قسم کے اخلاقی جرائم کے ساتھ آپ لفظ "مسلمان" کا جوڑ لگا ہوا پائینگے۔ سوسائیٹی میں پھریے۔ کہیں آپ کی ملاقات "مسلمان شرابیوں" سے ہوگی۔ کہیں آپ کو "مسلمان قمار باز" ملینگے۔ کہیں "مسلمان سازندوں" اور "مسلمان گویّوں" اور "مسلمان بھانڈوں" سے آپ دوچار ہونگے بھلا غور تو کیجیے یہ لفظ مسلمان کتنا ذلیل کردیا گیا ہے اور کن کن صفات کے ساتھ جمع ہو رہا ہے؟ مسلمان اور زانی! مسلمان اور چور! مسلمان اور شرابی! مسلمان اور قمار باز! مسلمان اور رشوت خوار! اگر وہ سب کچھ جو ایک کافر کرسکتا ہے وہی ایک مسلمان بھی کرنے لگے تو پھر مسلمان کے وجود کی دنیا میں حاجت ہی کیا ہے؟ اسلام تو نام ہی اس تحریک کا تھا جو دنیا سے ساری بداخلاقیوں کو مٹانے کے لیے اٹھی تھی۔ اس نے تو مسلمان کے نام سے اُن چیدہ آدمیوں کی جماعت بنائی تھی جو خود بلند ترین اخلاق کے حامل ہوں اور اصلاح اخلاق کے علمبردار بنیں۔ اس نے اپنی جماعت میں ہاتھ کاٹنے کی، پتھر مار مار کر ہلاک کردینے کی، کوڑے برسا برسا کر کھال اڑا دینے کی، حتیٰ کہ سولی پر چڑھا دینے کی ہولناک سزائیں اسی لیے تو مقرر کی تھیں کہ جو جماعت دنیا سے زنا کو مٹانے اٹھی ہے خود اُس میں کوئی زانی نہ پایا جائے، جس کا کام شراب کا استیصال ہے وہ خود شراب خواروں کے وجود سے خالی ہو، جسے چوری اور ڈاکہ کا خاتمہ کرنا ہے خود اس میں کوئی چور اور ڈاکو نہ ہو۔ اس کا تو مقصد ہی یہ تھا کہ جنہیں دنیا کی اصلاح کرنی ہے وہ دنیا بھر سے زیادہ نیک سیرت، عالی مرتبہ اور باوقار لوگ ہوں۔ اسی لیے قمار بازی، جعلسازی، اور رشوت خواری تو درکنار اس نے اتنا بھی گوارا نہ کیا کہ کوئی مسلمان سازندہ اور گویّا ہو، کیونکہ مصلحین اخلاق کے مرتبہ سے یہ بھی گری ہوئی چیز ہے۔ جس اسلام نے ایسی سخت قیود اور اتنے شدید ڈسپلن کے ساتھ اپنی تحریک اٹھائی تھی، اور جس نے اپنی جماعت میں چھانٹ چھانٹ کر بلند ترین کیرکٹر کے آدمیوں کو بھرتی کیا تھا، اسکی رسوائی اس سے بڑھ کر

اور کیا ہو سکتی ہے کہ رنڈی اور بھڑوے اور زانی اور چور تک کے ساتھ لفظ "مسلمان" کا جوڑ لگ جائے؟ کیا اس قدر ذلیل اور رسوا ہو جانے کے بعد بھی "اسلام" اور "مسلمان" کی یہ وقعت باقی رہ سکتی ہے کہ سر اسکے آگے عقیدت سے جھک جائیں اور آنکھیں اسکے لیے فرشِ راہ بنیں؟ جو شخص بازار بازار اور گلی گلی خوار ہو رہا ہو کیا کبھی اسکے لیے بھی آپ نے کسی کو ادب سے کھڑے ہوتے دیکھا ہے؟

یہ تو بہت ذلیل طبقہ کی مثال تھی۔ ذرا اونچے تعلیم یافتہ طبقہ کو دیکھیے کہ یہاں اسلام کی نمائندگی کس شان سے ہو رہی ہے۔

آج اپنے اخباروں اور رسالوں میں، اپنے جلسوں اور انجمنوں میں، اور اپنے پڑھے لکھے طبقہ میں آپ ہر طرف کس چیز کی پکار سنتے ہیں؟ بس یہی نا کہ سرکاری ملازمتوں میں ہمیں جگہیں ملیں غیر اسلامی نظام حکومت کو چلانے کے لیے جس قدر پرزے درکار ہیں ان میں سے کم از کم اتنے پرزے ہم پر مشتمل ہوں۔ من لم یحکم بما انزل اللہ میں کم سے کم اتنے فی صدی ہم بھی ہوں۔ والذین کفروا یقاتلون فی سبیل الطاغوت میں غالب حصہ ہمارا ہی رہے۔ اسی کی ساری چیخ پکار ہے۔ اسی کا نام اسلامی مفاد ہے۔ اسی محور پر آپ کی قومی سیاست گھوم رہی ہے۔ یہی گروہ عملاً اس وقت مسلم قوم کی پالیسی کو کنٹرول کر رہا ہے۔

اگر اسلام ایک تحریک کی حیثیت سے زندہ ہوتا تو کیا اس کا یہی نقطۂ نظر ہوتا؟ کیا کوئی اجتماعی اصلاح کی تحریک اور کوئی ایسی جماعت جو خود اپنے اصول پر دنیا میں حکومت قائم کرنے کا داعیہ رکھتی ہو، کسی دوسرے اصول کی حکومت میں اپنے پیرووں کو کل پرزے بننے کی اجازت دے سکتی ہے؟ کیا کبھی آپ نے سنا ہے کہ اشتراکیوں نے بینک آف انگلینڈ کے نظام میں اشتراکی مفاد کی حفاظت کا سوال اٹھایا ہو؟ یا فاشسٹ گرانڈ کونسل میں اپنی نمائندگی کے مسئلہ پر اشتراکیت کے بقاو فنا کا انحصار رکھا ہو؟ اگر آج

روسی کمیونسٹ پارٹی کا کوئی ممبر نازی حکومت کا وفادار خادم بن جائے تو کیا آپ توقع رکھتے ہیں کہ اسے ایک لمحہ کے لیے بھی پارٹی میں رہنے دیا جائیگا؟ اور اگر کہیں وہ نازی آرمی میں داخل ہو کر نازیت کو سربلند کرنے کی کوشش کرنے لگے تو کیا آپ اس کی جان کی سلامتی کی بھی امید کر سکتے ہیں؟ مگر یہاں آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟ اسلام جس روٹی کو زبان پر رکھنے کی اجازت بھی شائد انتہائی اضطرار کی حالت میں دیتا، اور جسکو حلق سے اتارنے کے لیے غیر باغٍ ولا عادٍ کی شرط لگاتا، اور پھر تاکید کرتا کہ جس طرح سخت بھوک کی حالت میں جان بچانے کے لیے سور کھایا جا سکتا ہے اُسی طرح بس یہ روٹی بھی بقدرِ سدِ رمق کھالو، یہاں اس روٹی کو نہ صرف ھنیأ مریأ کر کے پورے انبساط کے ساتھ کھایا جاتا ہے، بلکہ اسی پر کفر و اسلام کے معرکے سر ہوتے ہیں، اور اسی کو اسلامی مفاد کا مرکزی نقطہ قرار دیا جاتا ہے! اس کے بعد تعجب نہ کیجیے اگر ایک اخلاقی و اجتماعی مسلک کی حیثیت سے اور ایک مصلح تمدن کی حیثیت سے اسلام کے دعوائے حکمرانی کو سن کر دنیا مذاق اڑانے لگے۔ کیونکہ اسلام کی نمائندگی کرنے والوں نے خود اسکے وقار کو اور اسکے دعوے کو اپنے معبودِ شکم کے چرنوں میں بھینٹ چڑھا دیا ہے۔

اور دیکھیے۔ آپکے ہاں ایک صاحب بڑے طنطنہ کے ساتھ ایک فوجی تحریک لے کر اٹھتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ تمہاری شوکت رفتہ کو پھر تازہ کرونگا اور تمہیں زمین میں غلبہ دلوا کر چھوڑونگا۔ آپکے ہزاروں نہیں لاکھوں آدمی انکی طرف دوڑتے ہیں۔ لاکھوں ان سے فلاح و کامرانی کی آس لگاتے ہیں۔ آپکا پریس اِدھر سے اُدھر تک انکی حمایت کرتا ہے۔ اور دیکھتے دیکھتے یہ صاحب اسلام کے سپہ سالار اور ملت کے امیر مطاع بن جاتے ہیں۔ مگر آپ میں سے بہت کم لوگوں کو یہ خیال آتا ہے کہ انکے عقائد، انکے فہم قرآن، ان کے اخلاق، انکی گفتار، انکے اعمال، اور ان کے طریق کار کا بھی جائزہ لے کر دیکھ لیں۔ ایک شخص علانیہ جھوٹ بولتا ہے، جھوٹ پر اپنی تحریک کی پوری عمارت کھڑی کرتا ہے، غیر مسلموں تک کے سامنے اپنے

کذب و دروغ سے اسلام اور مسلمانوں کو رسوا کرتا ہے، اپنی بدزبانی اور لاف زنی سے مسلمانوں کے قومی اخلاق کی تذلیل وتضحیک کرتا ہے، غیر مسلموں کے مقابلہ پر آکر پہلی ضرب کھاتے ہی معافی مانگتا ہے، پھر اپنے وقار کو بچانے کے لیے علی الاعلان جھوٹ بولتا ہے کہ میں نے معافی نہیں مانگی، اور پھر لاف زنی کرتا ہوا وہیں لڑنے پہنچ جاتا ہے جہاں اس نے واپس نہ جانے کا عہد کیا تھا۔ تم یہ سب کچھ دیکھتے ہو اور اسکے باوجود اسکے پیچھے لگے رہتے ہو محض اس امید میں کہ یہ ہمیں دنیوی کامرانیوں سے ہمکنار کردیگا۔ ایک شخص کی تحریر وتقریر اور ایک ایک حرکت سے دنائت، سفلہ پن اور بازاریت ٹپکی پڑتی ہے، تقویٰ، صداقت، اور وقار کا نام ونشان تک نظر نہیں آتا اور تم اسکی امارت تسلیم کرنے میں ذرا تامل نہیں کرتے۔ حد یہ ہے کہ وہ پچاس ہزار مسلمانوں کی جانیں غیر مسلم حکومت کی خدمت کے لیے پیش کرتا ہے اور اس خدمت گذاری کا فائدہ تمہیں یہ بتاتا ہے کہ اس بہانے تم کو عسکری ٹریننگ مل جائیگی اور تمہاری فوجی پوزیشن مضبوط ہو جائیگی۔ تم اس ذلیل تدبیر کی خوراک بھی حلق سے نیچے اتار لیتے ہو اور خوش ہوتے ہو کہ ہمیں ایک فوجی تنظیم کرنے والا امیر تو مل گیا۔

یہ سب باتیں بتا رہی ہیں کہ تمہارا معیار اخلاق و انسانیت کس قدر گر گیا ہے۔ تم جس اسلام کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہو وہ دنیا میں یہ اصول قائم کرنے آیا تھا کہ انسان کا مقصد ہی صرف پاک نہ ہونا چاہیے بلکہ اسکو حاصل کرنے کے ذرائع بھی پاک ہونے چاہییں۔ مگر تمہارا حال یہ ہے کہ جس ذریعہ سے بھی تم کو کامیابی کے حصول کی امید نظر آتی ہے، خواہ وہ کتنا ہی ناپاک اور ذلیل ذریعہ کیوں نہ ہو، تم دوڑ کر اسے دانتوں سے پکڑ لیتے ہو اور جو تمہیں اس سے روکنا چاہے الٹا اسی کو کاٹ کھانے پر آمادہ ہو جاتے ہو۔ ذرائع کی پاکی و ناپاکی سے قطع نظر کر کے محض کامیابی کو مقصود بالذات بنانا تو دھریوں اور کافروں کا شیوہ ہے۔ اگر مسلمان نے بھی یہی کام کیا تو اسکی خصوصیت کیا باقی رہی؟ بلکہ یہ طریقہ اختیار کرنے کے بعد دوسری جاہل قوموں سے الگ، "مسلمان" کے جداگانہ وجود کے لیے کونسی وجہ جواز رہ جاتی ہے؟

اور اوپر چلیے۔ آپ کی سب سے بڑی قومی مجلس، مسلم لیگ، جسکو آٹھ نو کروڑ مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ ہے، ذرا اس کو دیکھیے کہ اِس آزمائش کی گھڑی میں وہ کس روش کا اظہار کر رہی ہے؟ حال میں اس نے جنگ کے متعلق جو ریزولیوشن پاس کیا ہے اور ہِز وائسرائے کے اعلان پر جس رائے کا اظہار کیا ہے اُس کو پڑھیے اور بار بار پڑھیے۔ اگر آپ ایک اصول پرست جماعت کے طرزِ عمل، اور ایک ایسی جماعت کے طرزِ عمل میں جو محض اپنی قوم کی سیاسی اغراض کی خدمت کے لیے بنی ہو، فرق و امتیاز کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، تو اوّل نظر میں آپ کو محسوس ہو جائیگا کہ جنگ کے موقع پر جو پالیسی لیگ نے اختیار کی ہے وہ اصول پرستی کے ہر نشان سے خالی ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ درحقیقت یہی پالیسی مسلمانوں کے ذہن کی ترجمانی کرتی ہے، تو اِس کے آئینہ میں ہر صاحب نظر آدمی دیکھ سکتا ہے کہ ان نام نہاد مسلمانوں پر پوری طرح اخلاقی موت وارد ہو چکی ہے۔ مقامی طور پر ہندوستان میں مسلمانوں کی جو سیاسی پوزیشن اس وقت ہے، اِس پوزیشن میں اگر دنیا کی کوئی اور قوم ہوتی تو اس کی لیگ بھی ایسی ہی پالیسی اختیار کرتی، اور قریب قریب انہی الفاظ میں اپنا ریزولیوشن مرتب کرتی۔ آپ مسلم کے بجائے، سکھ، پارسی، جرمن، اٹالین، جو نام چاہیں رکھ سکتے ہیں۔ یہی سیاسی موقف اور یہی مقامی حالات اُس کے ساتھ وابستہ کر دیجیے، اور پھر بڑی آسانی کے ساتھ آپ اس ریزولیوشن کو ان میں سے ہر قوم کی طرف منسوب کر سکتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ مسلمان اب اُسی سطح تک گر گیا ہے جس سطح پر دنیا کی دوسری تمام قومیں ہیں۔ ایک موقع و محل پر دنیا کی کوئی کافر و مشرک قوم جو طرزِ عمل اختیار کر سکتی ہے وہی مسلمان بھی اختیار کر رہا ہے۔ وہ بالکل بھول گیا ہے کہ میں اوّلاً اور بالذات ایک اخلاقی اصول کا نمائندہ اور وکیل ہوں، اِسی حیثیت سے میرا نام مسلمان ہے، میرا کام سب سے پہلے ایک معاملہ کے اخلاقی پہلو کو دیکھنا ہے، اور میری مسلمان ہونے کی حیثیت کا تقاضا یہ ہے کہ اسی پہلو پر اپنے فیصلہ کا مدار رکھوں۔ اگر میں نے بھی صرف یہی دیکھا کہ پیش آمدہ معاملہ خود مجھ پر اور میری

(بقیہ مضمون صفحہ ۶ پر ملاحظہ ہو)

چند احکامِ دین

انہ تذکرۃ فمن شاء ذکرہ

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ۔ (انفال - ۱۰)

اور جو لوگ ایمان تو لائے مگر دار الکفر سے ہجرت کر کے دار الاسلام میں چلے نہ آئے انکی دوستی اور حمایت و حفاظت کا کوئی حق تم پر (یعنی دار الاسلام کے مسلمانوں پر) نہیں ہے جب تک کہ وہ دار الاسلام میں ہجرت کر کے نہ آجائیں البتہ اگر وہ دین کے معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو انکی مدد کرنا تمہارا فرض ہے، لیکن کسی ایسی قوم کے مقابلہ میں تم ان کی مدد نہیں کرسکتے جس سے تمہارا معاہدہ ہو چکا ہو۔

اَنَا بَرِیْءٌ من کل مسلم یقیم بَیْنَ اَظْهُرِ المشرکین ۔ (حدیث)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں ہر اس مسلمان کی حفاظت سے بری الذمہ ہوں جو مشرکوں کی عملداری میں رہتا ہو۔

من اقام مع المشرکین فقد برئت منہ الذمہ (حدیث)

دوسری حدیث میں ہے کہ جس نے مشرکوں کے ساتھ رہنا اختیار کیا اس کا میں ذمہ دار نہیں ہوں۔

من فی دار الحرب فی حق من ھو فی دار الاسلام کالمیت (کتاب المبسوط سرخسی جلد ۱۰ - صفحہ ۹۲)

جو شخص دار الحرب میں رہتا ہو وہ دار الاسلام والوں کے لیے مردہ کے حکم میں ہے۔

یہ احکام دراصل اسلام کے دستوری قانون سے تعلق رکھتے ہیں۔ انکی رو سے غیر مسلم حکومت میں رہنے والوں کی حیثیت، مسلم حکومت میں رہنے والوں کی حیثیت سے جدا کر دی گئی ہے۔ ان کے الفاظ اور معانی پر غور کرنے

سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں۔

(۱) مسلم حکومت دوسری قوموں اور حکومتوں سے جنگ یا صلح کے جو کچھ بھی معاملات کریگی وہ خود اپنے مصالح کو دیکھ کر کریگی - اس پر یہ لازم نہیں ہے کہ اپنی خارجی پالیسی معین کرنے میں ان مسلمانوں کا لحاظ کرے جو کسی غیر مسلم حکومت کے غلام ہوں - اگر اسکو کسی ایسی غیر مسلم حکومت سے صلح یا مسالمت یا معاہدۂ غیر جانبداری یا معاہدۂ دوستی کرنیکی ضرورت پیش آجائے جسکی غلامی میں مسلمانوں کی کوئی جماعت پسی جا رہی ہو، تو وہ اپنے سیاسی مصالح کی رعایت سے ایسا معاہدہ کرنیکی پوری طرح مجاز ہے، اور معاہدہ ہو جانے کے بعد اُن غلام مسلمانوں پر خواہ کچھ بھی گذر جائے مسلم حکومت انکی کوئی مدد نہیں کر سکتی -

(۲) جسطرح مسلم حکومت اُن مسلمانوں سے بری الذمہ ہے جو کسی غیر مسلم حکومت کے غلام ہوں، اسیطرح ان غلام مسلمانوں پر بھی یہ لازم نہیں کیا گیا ہے کہ وہ لامحالہ اپنی سیاسی پالیسی کا دامن کسی آزاد مسلم حکومت کی خارجی پالیسی کے ساتھ ہی باندھے رکھیں - اگر ان کے کافر آقاؤں کیساتھ مسلم حکومت نے اپنی کسی مصلحت سے معاہدہ کر لیا ہو تو اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ اب ان مظلوم مسلمانوں کے لیے بھی ان کافروں کی خواجگی تسلیم کر لینا اور شرائط بندگی بجالانا لازم آگیا۔ انکا یہ فرض بہرحال اپنی جگہ قائم رہیگا کہ یا تو اس خواجگی کے طلسم کو توڑنے کے لیے جدوجہد کریں یا پھر دارالاسلام کی طرف ہجرت کر جائیں، کیونکہ جب تک وہ کافر کی بندگی میں رہینگے، قرآن کی رو سے اپنے نفس پر ظلم کے مرتکب ہوتے رہینگے (اِنَّ الَّذِیۡنَ تَوَفّٰہُمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ ظَالِمِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ الآیہ)

امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں:

واکرہ للرجل ان یطأ امتہ او امرتہ فی دار الحرب مخافۃ ان یکون لہ فیہا نسل لانہ ممنوع من التوطن فی دار الحرب	میں تو اسکو بھی مکروہ سمجھتا ہوں کہ کوئی مسلمان دار الحرب میں اپنی لونڈی یا بیوی سے مباشرت کرے کیونکہ خوف ہے کہ وہاں اسکی نسل پیدا ہوگی حالانکہ اس کے لیے دار الحرب کو اپنا وطن بنانا ممنوع

... ربما يبقى له نسل فيتخلق ولده باخلاق المشركين۔ (مبسوط - ج ١٠ - ص٣١)

ہے ... کہیں ایسا نہ ہو کہ وہاں اسکی نسل باقی رہ جائے اور اسکی اولاد مشرکین کے اخلاق لیکر اٹھے۔

امام برحق کا یہ ارشاد ہر شرح و تفسیر سے بے نیاز ہے۔ جس شخص میں اسلامی حس موجود ہو وہی اس قول کی صحیح قدر کر سکتا ہے۔

عن ابن عباس قال ما قاتل رسول الله صلعم قوما حتى دعاهم الى الاسلام (حديث)

ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی قوم سے اسوقت تک جنگ نہیں کی جبتک کہ پہلے اسکو اسلام کی طرف دعوت نہ دے لی ہو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل کو جنگ پر بھیجتے وقت جو ہدایات دی تھیں وہ یہ تھیں:۔

لا تقاتلوهم حتى تدعوهم فان ابوا فلا تقاتلوهم حتى يبدؤكم فان بدؤكم فلا تقاتلوهم حتى يقتلوا منكم قتيلا ثم اروهم ذالك القتيل وقولوا لهم هل الى خير من هذا سبيل فلان يهدى الله تعالىٰ على يديك خير لك مما طلعت عليه الشمس وغربت

ان سے جنگ نہ کرنا جبتک کہ پہلے انکو اسلام کی طرف دعوت نہ دے لو۔ پھر اگر وہ اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیں تب بھی جنگ نہ کرنا جب تک وہ جنگ کی ابتدا نہ کریں، پھر اگر وہ ابتدا کر دیں تب بھی نہ لڑنا جب تک کہ وہ تم میں سے کسی کو قتل نہ کر دیں۔ پھر جب وہ قتل کر دیں تو مقتول کی لاش کو انہیں دکھا کر کہنا کیا اس سے زیادہ بہتر کسی بات کیلیے کوئی راہ نہیں ہے؟ بولے معاذ یہ سب ہدایتیں اسلیے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ تیرے ذریعہ سے کسی انسان کو راہ راست دکھا دے تو وہ تیرے لیے زیادہ قیمتی ہے بہ نسبت اسکے کہ تیرے قبضے میں وہ ساری زمین اور دولت آجائے جس پر سورج طلوع اور غروب ہوتا ہے۔

لو قاتلوهم بغير دعوة كانوا آثمين في ذالك ... شرط الاباحة تقديم الدعوة فبدونه لا يثبت - (مبسوط ج ١٠ - ص ٣١-٣٠)

اگر مسلمان کافروں کے کسی گروہ کو اسلام کی طرف دعوت دیے بغیر لڑیں گے تو گناہگار ہونگے ... کافروں کی جان و مال مباح ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ پہلے انہیں دعوت دیجائے اسکے بغیر قتل کرنا اور مال لوٹنا حرام ہے۔

امام شافعی کے نزدیک تو دعوت الی الاسلام کے بغیر قتل اور لوٹ مار کرنا صرف گناہ ہی نہیں ہے، بلکہ اس سے مسلمانوں پر ضمان لازم آتا ہے

ان الغنيمة اسم لمال مصاب باشرف الجهات وهو ان يكون فيه اعلاء كلمة الله تعالى واعزاز الدين ولهذا جعل الخمس منه لله تعالى وهذا المعنى لا يحصل فيما ياخذه الواحد على سبيل التلصص۔

غنیمت اس مال کا نام ہے جو شریف ترین طریقہ سے حاصل ہو یعنی ایسے طریقے سے جس میں اللہ کا کلمہ بلند ہو اور اسکے دین کی عزت قائم ہو۔ اسی لیے اس مال میں سے پانچواں حصہ اللہ کے نام کا نکالا جاتا ہے۔ یہ حیثیت اُس مال کی نہیں ہے جسکو کوئی شخص ڈاکو کی حیثیت سے کسی ملک میں گھس کر حاصل کرے

عن يعلى بن امية قال آذن رسول الله صلى الله عليه وسلم بالغزو وانا شيخ كبير ليس لي خادم فالتمست اجيرا يكفيني فوجدت رجلا سميت له ثلاثة دنانير فلما حضرت غنيمة اردت ان اجري له سهمه فجئت النبي صلعم فذكرت له فقال ما اجد له في غزوته هذه في الدنيا والآخرة الا دنانيره التي تسمى (ابو داؤد)

یعلیٰ بن امیہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کا اعلان کیا اور میں بوڑھا تھا اور کوئی خادم میرے پاس نہ تھا آخر کار میں نے ایک شخص کو ۳ اشرفیوں پر نوکر رکھ لیا کہ میری خبرگیری کرے۔ جب لڑائی میں مال غنیمت آیا تو میں نے چاہا کہ اس نوکر کو بھی حصہ دیا جائے چنانچہ رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر میں نے اسکا ذکر کیا۔ حضور نے جواب دیا کہ میرے نزدیک تو دنیا اور آخرت میں اسکے لیے کوئی حصہ نہیں بجز ان تین اشرفیوں کے جو اسکی تنخواہ مقرر کردی گئی ہیں۔

نوٹ کیجیے کہ یہ خدا کی راہ میں جہاد تھا جس کے کمانڈر خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ اس لڑائی میں بھی اجرت کی خاطر شریک ہونے والے کی وہ حیثیت تھی جو اوپر بیان ہوئی۔ رہی وہ جنگ جو ایک قوم دوسری قوم کے خلاف محض اپنی بڑائی کے لیے لڑے، تو اس میں کرایہ پر لڑنے والے سپاہی کی کیا حیثیت ہے؟ ..... اسکو ان "محافظین اسلام" سے پوچھیے جو کہتے ہیں کہ ایسی لڑائی میں حصہ نہ لینا خدا کے ساتھ غداری ہے! معلوم نہیں کہ وہ کونسا خدا ہے جس کے ساتھ یہ غداری ہے۔

عن معاذ قال قال رسول الله صلعم الغزو غزوان فاما من ابتغى وجه الله واطاع الامام وانفق الكريمة وياسر الشريك واجتنب الفساد

حضرت معاذ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا لڑائیاں دو قسم کی ہیں، جس نے خالص خدا کے لیے امام مسلمین کی اطاعت میں جنگ کی اور اپنا بہتر مال اس میں خرچ کیا اور اپنے رفیقوں کی آسائش کا خیال رکھا

فان نومه ونبهه اجر کله واما من غزا فخراً وریاءً وسمعة وعصی الامام وافسد فی الارض فانه لم یرجع بالکفاف (حدیث)

اور فساد سے پرہیز کیا اس کا سونا اور جاگنا سب کچھ اجر کا مستحق ہے۔ اور جس نے فخر اور ریا اور نام و ریکے لیے جنگ کی، امام مسلمین کی نافرمانی کی اور زمین میں فساد برپا کیا وہ خدا کے مقابلہ میں برابر بھی نہ چھوٹے گا (یعنی ایسا بھی نہ ہوگا کہ وہ اجر کا مستحق نہ ہو تو سزا کا مستحق بھی نہ ہو، بلکہ اسے سزا ل کر رہے گی)

یاد رہے کہ یہ بھی اُس جنگ کے لیے ہے جو امام مسلمین کے جھنڈے کے نیچے لڑی جارہی ہو، اور جس میں کوئی مسلمان خدا کی رضاجوئی کے لیے نہیں بلکہ اپنے نفس کی خاطر شریک ہو۔ رہی وہ جنگ جو ائمۂ کفر کے جھنڈے کے نیچے لڑی جائے اور جس میں خدا کی رضاجوئی کا سرے سے کوئی سوال ہی نہ ہو......

عن عبد اللہ بن عمرو انہ قال یا رسول اللہ اخبرنی عن الجھاد فقال یا عبد اللہ ان قاتلت صابراً محتسباً بعثک اللہ صابراً محتسباً وان قاتلت مرائیاً مکاثراً بعثک اللہ مرائیاً مکاثراً یا عبد اللہ علیٰ ای حال قاتلت او قتلت بعثک اللہ۔

عبد اللہ بن عمرو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ مجھے بتایئے کہ جہاد کیا ہے۔ آپ نے فرمایا اے عبد اللہ اگر تم نے راہ خدا میں جم کر اور اپنے آپ کو خدا کے سامنے حساب دینے کے لیے تیار رکھ کر جنگ کی تو اللہ تم کو قیامت میں ایسا ہی اٹھائیگا اور اگر تم نے دنیا کو دکھانے کے لیے اور اپنی خوشحالی کے لیے جنگ کی تو اللہ تم کو قیامت میں اسی حیثیت سے اٹھائیگا۔ اے عبد اللہ جس حیثیت سے تم جنگ کروگے یا مارے جاؤگے اسی حیثیت سے تم اٹھائے بھی جاؤگے۔

مقالات

دلائل السنن والآثار

(۱۰)

از جناب مولوی نجم الدین صاحب اصلاحی

دلائل منکرین حدیث منکرین حدیث، احادیث کو وہی درجہ دیتے ہیں جو درجہ اسرائیلیات کا ہے - یعنی جس طرح اسرائیلیات سے مذہب اہل کتاب کی تاریخ معلوم ہوتی ہے اسی طرح احادیث سے بھی محض مذہب اسلام کی تاریخ معلوم ہوتی ہے نہ کہ راہ نجات - ان کے نزدیک راہ نجات بتانے کے لیے صرف قرآن کافی ہے حسبنا کتاب اللہ - ان کا طریق استدلال یہ ہے کہ -

(۱) قرآن مجید مفصل اور مکمل کتاب الٰہی اور دین ہے - کِتَابٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ - ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ -

(۲) خداوند تعالیٰ کی طرف سے پیغمبر خدا صلعم پر صرف فریضۂ تبلیغ عائد کیا گیا تھا - مَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغُ -

(۳) صاحب امر و نہی ہونا صرف خدائے پاک کا حق ہے - اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ -

پس نتیجہ یہ نکلا کہ اگر احادیث صحیح و معتبر بھی ہوں تو ہم اپنے دین کے معاملہ میں ان سے بے نیاز ہیں!

اس طریق استدلال کے اکثر اجزاء کی غلطی گذشتہ صفحات میں واضح ہو چکی ہے - حدیث

اور تاریخ کے فرق کو ہم نے مفصل بیان کر دیا ہے۔ اسی طرح سورۂ جمعہ کی آیات کی تشریح میں ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ خود قرآن کی رو سے آنحضرت صلعم کا منصب نبوت کن شعبوں پر مشتمل تھا۔ وہ بحث اگر آپ کے پیش نظر ہے تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وما علی الرسول الا البلاغ سے استدلال کر کے آنحضرت کو کفار کی طرح مسلمانوں کے لیے بھی محض مبلغ قرار دینا کس قدر غلط ہے۔ تیسرے شبہے کا جواب بھی دین اور شریعت کے فرق کے سلسلہ میں گذر چکا ہے۔ اب صرف پہلا شبہ باقی رہ جاتا ہے، سو اسی پر ہم یہاں کلام کرتے ہیں۔ بات کو زیادہ طول دینے سے بہتر یہ ہے کہ جن آیات کو منکرین حدیث اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا ترجمہ اور مفہوم بیان کر کے ہم بحث کو ختم کر دیں۔ جسکا دل چاہے مانے اور جسکا دل چاہے رد کر دے۔

حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن است و بس   دربند آں مباش کہ نشنید یا شنید

(۱) کِتَابٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ ۝ (سورۂ ہود) — یہ کتاب ہے کہ ثابت کی گئی ہیں آیتیں اسکی، پھر کھولی گئی ہیں حکمت والے خبردار کے پاس سے۔

یعنی یہ قرآن کریم وہ جلیل القدر کتاب ہے جسکی آیات لفظ اور معنی ہر ایک لحاظ سے کامل ہیں۔ الفاظ کی قبا معانی کی قامت پر ذرا نہ ڈھیلی ہے نہ تنگ۔ پھر الفاظ و معانی کی گہرائی کو اسی حکیم و خبیر نے جس کی تصنیف یہ کتاب ہے، تفصیل کے ساتھ کھول کھول کر سمجھا بھی دیا ہے۔ اسی مفہوم کو قرآن کریم نے ایک دوسرے اسلوب کے ساتھ یوں تعبیر کیا ہے۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ۔ "پھر مقرر ہمارا ذمہ ہے اسکو کھول کر بتلانا"۔ یعنی جس طرح قرآن کو ایک کتاب کی صورت میں جمع کر دینا ہمارا کام ہے اسی طرح اس کے معانی اور مطالب کی تشریح کرنا بھی ہمارا ہی کام ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کے مطالب اور معانی کی یہ تفصیل و تشریح، جس کو اللہ تعالیٰ خود اپنا کام قرار دے رہا ہے، کس کو بتائی گئی ہے؟ نبی کو یا عام انسانوں کو؟ ظاہر ہے کہ عام انسانوں کو تو نہیں بتائی گئی

کیونکہ قرآن کی شرح میں کوئی کتاب آسمان سے نہیں آئی - لہٰذا یہی ماننا پڑیگا کہ یہ تفصیلی و تشریحی علم پیغمبر کو دیا گیا ہے تاکہ وہ آدوسرے لوگوں تک پہنچاوے - یہ محض قیاسی بات نہیں ہے بلکہ قرآن خود بھی یہی کہتا ہے لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ - یعنی پیغمبر سے ارشاد ہورہا ہے کہ جو کتاب لوگوں کی ہدایت کے لیے نازل کی گئی ہے اس کو سمجھانا اور اسکے مطالب کی تشریح کرنا تمہارا کام ہے - اس سے بڑھ کر اور کوئی ثبوت اس امر کا نہیں ہوسکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے احکام اور اسکی تعلیمات کی جو تشریح اور عبادات و معاملات کی جو تفصیلی صورت اپنے قول اور عمل سے بیان فرمائی وہ اسی طرح من جانب اللہ تھی جس طرح خود قرآن من جانب اللہ ہے، اور دونوں کا تعلق ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم کا سا ہے - اسکی مثال ایسی ہے جیسے ایک طالب علم نے کسی کتاب کو خود مصنف سے پڑھا ہو، اور مصنف نے اپنے مقاصد کو آپ اپنی زبان سے اسکے ذہن نشین کردیا ہو، اسکے بعد وہ طالبعلم استاد بنکر وہی کتاب دوسرے لوگوں کو پڑھائے تو یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ کتاب کی جو شرح وہ بیان کررہا ہے وہ عین مصنف کی شرح ہے، خصوصاً جبکہ خود مصنف اس کی تصدیق بھی کردے، تو کسی دوسرے شخص کو یہ کہنے کا کیا حق رہ جاتا ہے کہ مصنف کی کتاب تو مستند ہے مگر اسکے شاگرد کی تشریح مستند نہیں ہے؟

(۲) وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ (سورۂ نحل) — اور اتاری ہم نے تجھ پر کتاب کھلا بیان ہر چیز کا۔

یہ آیت اور اسکے مثل آیات قرآن میں اور بھی موجود ہیں - اور عجیب بات ہے کہ قرآن اور توراۃ دونوں کا ذکر بہت سے مقامات پر ساتھ ساتھ آیا ہے - سورہ انعام اور سورہ جن وغیرہ کو پڑھنا چاہیے سورۂ نحل کی آیت کا مفہوم متعین کرنے کے لیے سورۂ یوسف کی آیت مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ الخ اور سورۂ انعام کی

آیت ثُمَّ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتَابَ تَمَامًا عَلَی الَّذِیْ اَحْسَنَ وَتَفْصِیْلًا لِّکُلِّ شَیْءٍ الخ
کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ ایک طالب نظم جب سیاق وسباق آیات پر غور کرتا ہے تو لفظ کل شی وغیرہ کو جس
طرح توریت کی صفت میں پاتا ہے اسی طرح ان الفاظ کو قرآن کے لیے بھی۔ پس ان آیات کا مفہوم
صاف طور پر متعین ہو جاتا ہے کہ جو احکام اوپر قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّکُمْ عَلَیْکُمْ سے پڑھکر
سنائے گئے تھے یہ ہمیشہ سے جاری تھے۔ تمام انبیاء اور شرائع کا ان پر اتفاق رہا۔ بعدہ حق
تعالی نے حضرت موسی علیہ السلام پر توراۃ اتاری جس میں احکام شرع کی مزید تفصیل درج تھی۔
توریت عطا فرما کر اس زمانہ کے نیک کام کرنے والوں پر خدا نے اپنی نعمت پوری کردی۔ ہر ضروری
چیز کو شرح وبسط سے بیان فرمادیا اور ہدایت ورحمت کے ابواب مفتوح کردیئے تاکہ اسے سمجھ کر
لوگ اپنے پروردگار سے ملنے کا کامل یقین حاصل کریں۔ بہرحال توریت کو تفصیل کل شی کہنے کا مفہوم
صرف اسی قدر ہے کہ اس سے پہلے کی جو تعلیمات تھیں توراۃ میں اُن کی مزید تفصیل کردی گئی ہے۔ اور
اسی طرح قرآن حکیم جو ناسخ الادیان والشرائع ہے، اپنے سے پہلے کی تمام کتب سماویہ کی تعلیمات کا محافظ
اور ساتھ ہی پہلے کی تمام افراتفری کا مصلح اور مکمل بنکر آیا۔ اس نے توحید ورسالت، معاش
ومعاد اور عقائد واعمال کی تفصیلات ومہمات کو خوب کھول کر بتایا۔ توریت تو بہیئت مجموعی خاص
قوم کے لیے تھی جو اس وقت اور اس قوم کے اعتبار سے جامع، کامل اور تمامًا علی الذی احسن کی
مصداق تھی۔ لیکن قرآن عزیز جو اپنے درخشاں اور ظاہری وباطنی حسن وجمال سے تبیانا لکل شی،
اور مہیمنا علیہ ہے، اسکا کھلا مفہوم یہ ہے کہ تمام علوم ہدایت اور اصول دین اور فلاح دارین سے
متعلق ضروری امور کا نہایت مکمل اور واضح بیان اسکے اندر موجود ہے۔ چنانچہ سورۂ نحل کی آیت
کے بعد ہی اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ الخ کو لاکر تبیانا لکل شی کے مفہوم کو
بتادیا اور اسی بناپر حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کو کہنا پڑا کہ اللہ تعالی نے تمام خیر وشر کو اسی

آیت میں بیان کر دیا ہے[1] - حضرات علمار سلف نے تو یہانتک فرماد یا کہ اگر قرآن میں کوئی دوسری آیت نہ ہوتی تو صرف آیت اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ الخ ہی اس کتاب کے تبیانا لکل شی ہونے کا ثبوت دینے کو بس تھی -

اس میں کس کو شبہ و اعتراض ہوگا کہ قرآن مجید اپنی بہت سی اصولی باتوں کے بیان کرنے میں کسی خارج کا محتاج نہیں ہے ، مگر بات یہیں ختم تو ہو تی نہیں بلکہ صدہا آیات احکام وغیرہ ایسی ہیں جو صاحب قرآن کے شرح و بیان کی محتاج تھیں - رہ گیا یہ شبہہ کہ صاحب امر و نہی اللہ تعالیٰ ہے اس لیے حلال و حرام وغیرہ کا وہی حاکم ہے ، کسی اور کو اسکا رتبہ دینا گویا اللہ و رسول کی دو متوازی شریعت و حکومت قائم کرنا ہے ، سو اسکا جواب ہم ذیل کی سطروں میں دینا چاہتے ہیں -

اصل یہ ہے کہ سنن و آثار ، احادیث و اخبار نبوی کا ایک سلسلہ ایسا ہے جو بظاہر قرآن پاک سے مختلف یا تعلیمات قرآنیہ سے دور نظر آتا ہے - ایک جماعت نے ان احادیث کی توجیہ ناممکن سمجھ کر احادیث کی حفاظت کا دوسرا راستہ اختیار کیا اور بنا بر روایت مقدام ابن معدی کرب رض احادیث کو قرآن کریم کے مقابل ایک مستقل حیثیت دیدی حالانکہ قطعاً اس کی ضرورت نہ تھی - اسلئے لوگوں کو غلط فہمی ہوئی اور انہوں نے سرے سے سنن و آثار نبوی کی مذہبی و شرعی نوعیت ہی کو ماننے سے انکار کر دیا - روایت ابو داؤد " او تیت القرآن ومثلہ معہ " کا صحیح مفہوم بحث درایت میں مفصل لکھا جا چکا ہے ، وہاں دیکھ لیا جائے - اللہ و رسول کی دو الگ الگ شریعتیں قائم کرنا نہ تو سلف سے ثابت اور نہ خلف میں محققین علمار سنت کا مذہب رہا ہے - اور آنحضرت صلعم کو اللہ تعالیٰ کی طرح صاحب امر و نہی وغیرہ ماننا تصریحات قرآن اور سلف کے خلاف ہے - بلکہ واقعہ اور حقیقت یہ ہے کہ سنن ، احکام مستنبطہ از قرآن مجید ، اور احکام قرآنیہ بعبارت

---

[1] ابن کثیر -

پیغمبر خدا صلعم، یہ وہ چیزیں ہیں جنکی قطعیت میں شک کرنا، انصاف، علم اور پیغمبر کی عصمت کے منافی ہے آپ نے جو احکام بیان فرمائے، اور جن چیزوں کی حلت و حرمت کا فتویٰ دیا مجملاً انکی تصدیق خود قرآن نے یہ کہہ کر فرما دی کہ یحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث - اگر کوئی شخص اس کو یہ معنی پہناتا ہے کہ پیغمبر نے اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام اور اللہ کے حرام کو حلال کیا تو یہ اسکی نافہمی ہے یہاں دو شریعتیں نہیں بلکہ ایک ہی شریعت ہے - جب بدلائل یہ ثابت ہو چکا ہے کہ پیغمبر کا اجتہاد بھی دین کے معاملہ میں غلطی سے پاک ہوتا ہے تو جہاں پیغمبر اپنے قول یا عمل سے قرآن کے مقصود و مدعا کی تشریح کرے یا تصویر کھینچے یا ہم کو دین کا حکم بتائے تو اسے کیوں نہ من جانب اللہ سمجھا جائے؟ کیوں یہ گمان کیا جائے کہ پیغمبر نے یہ باتیں اپنے دل سے گھڑی تھیں؟ کیوں نہ پیغمبر کے اس قول کو ذات حق سے تعلق رکھنے کی بنا پر صحیح سمجھا جائے کہ وان ما حرم رسول اللہ کما حرم اللہ (او کما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام)؟

اب سوال یہ ہے کہ ہمارے لیے موجودہ حالت میں کون سی راہ صحیح راہ ہے؟ قرآن حکیم کی تعلیمات پر اپنی فہم کے مطابق پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی سے بے نیاز ہو کر عمل کرنا؟ یا رسول اللہ صلعم کی پیروی اور آپ کے عمل کو نمونہ اور اسوہ بنانا؟ بہتر یہ ہے کہ اس سوال کا جواب کتاب اللہ ہی میں تلاش کیا جائے کیونکہ یہ کتاب ہر فریق کے نزدیک مسلم ہے - کیا مندرجہ ذیل آیات عام مسلمانوں کے عقائد کی صحت کا قطعی ثبوت نہیں ہیں؟

(۱) لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنْ کَانَ یَرْجُوا اللّٰہَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیْرًا

تمہارے لیے رسول میں اچھا نمونہ ہے، تم میں سے ہر اس شخص کے لیے جو امید رکھتا ہے اللہ کی اور آخرت کے دن کی اور جو بہت یاد کرتا ہے اللہ کو۔

(۲) اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ (سورہ آل عمران)

اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو۔

(۳) اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (فاتحہ)	چلا ہم کو راہ سیدھی، راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے فضل کیا،
(۴) فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ (سورہ ن)	(اوپر ذکر چلا آرہا ہے کہ جو شخص اللہ و رسول کا کہنا مانیگا) تو ایسے اشخاص بھی ان حضرات کے ساتھ ہونگے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاء، اور صدیقین، اور شہداء اور صلحاء ـ

آخر کی دونوں آیتوں پر غور کرنے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ صراط مستقیم وہی راستہ ہے جس پر انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین امت چلے ہیں۔ اور اسی صراط مستقیم کا دوسرا نام سنت رسول ہے۔ سنت کے معنی بھی راستہ ہی کے ہیں۔ اسی سلسلہ میں یہ آیت بھی ملاحظہ ہو۔

وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۵ (سورہ ن)	اور جو شخص چلے مومنوں کی راہ کے خلاف تو ہم اسکو اسکے اختیار کیے ہوئے راستہ پر چلا کر بالآخر داخل جہنم کرینگے اور وہ بہت بری جگہ پہونچیگا۔

اسی وجہ سے کتاب اللہ اور سنت رسول دونوں دین کے دو رکن مانے گئے۔ ایک علم خالص ہے اور دوسرا اسی علم کی عملی تفصیل ہے علماء اصول فقہ نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ "ان السنۃ المطہرۃ مستقلۃ بتشریع الاحکام الخ"

خدا نے اصل دین کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا سو وہ وعدہ سچا ثابت ہوا۔ قرآن کی حفاظت کتابت، تلاوت، اور حفظ سے ہوئی، اور سنن و آثار نبوی کی حفاظت کے جہاں اور بہت سے اسباب اوپر ذکر ہو چکے ان میں سے سب سے زبردست حفاظت اس طرح ہوئی کہ آنحضرت صلعم نے احکام قرآنی پر عمل کیا، صحابہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، دل سے یاد کیا، خود عمل کیا اور ساری دنیا میں اسکی تبلیغ فرمائی۔ یہیں سے یہ بات بھی مدنظر رکھنی چاہیے کہ سنت کی قطعیت قرآن مجید کی قطعیت

سے کسی طرح کم نہیں ہے - دیکھو، ہر آبادی میں قرآن مجید کے حافظوں کی تعداد محدود رہی ہے، مگر احکام شرعیہ پر عمل کرنے والے قریباً تمام مسلمان ہیں - نماز، روزہ، حج، زکوۃ کی مخصوص صورتوں میں کون شک کرسکتا ہے - کیونکہ ان پر دنیا کے تمام مسلمانوں کا باختلاف یسیر تعامل چلا آتا ہے باقی رہے جزئی اختلافات، سو ان کے بارے میں قول حق یہ ہے کہ انکے ترک یا عمل پر نجات موقوف نہیں ہے - مدار نجات وہی ہے جس پر بلا اختلاف تعامل چلا آتا ہے -

ان سب کے آخر میں ہم ایک قول فیصل جو الحمد للہ سنن و آثار نبوی کے حجت شرعی ہونے پر محکم ہے، سورۂ احقاف سے نقل کرکے اس بحث کے قرآنی پہلو کو ختم کرتے ہیں اور اہل علم پر فیصلہ چھوڑتے ہیں - وہ آیت کریمہ یہ ہے :-

ایْتُونِي بِكِتَابٍ مِّن قَبْلِ هَٰذَا	لاؤ میرے پاس کوئی کتاب اس
أَوْ أَثَارَةٍ مِّنْ عِلْمٍ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ	سے پہلے کی یا چلا آتا کوئی علم اگر ہو تم
(سورۂ احقاف)	سچے،

منکرین قیامت اور قرآن کے رد میں پہلے سے یہ بیان چلا آتا ہے کہ اللہ تعالی نے زمین آسمان اور کل مخلوقات کو بنایا - کیا سچے دل سے کہا جاسکتا ہے کہ زمین یا آسمان کا کوئی حصہ کسی اور نے بھی بنایا ہے یا بنانے پر قادر ہے؟ ہرگز نہیں - تو پھر خدا کے ساتھ معبودان باطل کو کیوں پکارا جاتا ہے؟ لہٰذا اگر تم اپنے دعوائے شرک میں سچے ہو تو کسی آسمانی کتاب کی سند لاؤ یا کسی ایسی علمی بات سے ثابت کرو جو اہل علم کے نزدیک مسلم چلی آتی ہو -

آیت مذکورہ کا فقرہ أَوْ أَثَارَةٍ مِّنْ عِلْمٍ خاص طور پر قابل غور ہے - اللہ تبارک و تعالی نے اس علم کو بھی حجت و دلیل قطعی مانا ہے جو اہل علم کے نزدیک ثابت اور مسلم مروی ہوتا چلا آیا ہو - لفظ اثر کی لغوی تحقیق کرجاؤ اور آیت "سِحْرٌ يُؤْثَرُ" کے مادہ پر بھی نظر رکھو - دیکھو کیا أَثَارَةٍ مِّنْ عِلْمٍ ہی سے علم کی روایت کرنا اور آثار کو احادیث کے مرادف ماننا قرآن

سے ثابت نہیں ہوتا ہے؟ اور کیا سنن و آثار نبوی کا علم ابتداء سے اہلِ علم کے نزدیک مسلم نہیں رہا ہے؟ اور کیا یہ سلسلہ حدثنا و اخبرنا کوئی علمی و شرعی بات نہیں ہے؟ ہوش میں آؤ اور عقل دوراندیش سے کام لو۔ جس طرح بہتوں نے ہزاروں حدیثیں محض قرآن کی طرف مائل کرنے کے لیے بنائیں اور من کذب علی متعمداً الخ کی وعید میں آگئے، کیا اسی طرح آج وہ لوگ جو قرآن سے بظاہر حسنِ ظن رکھتے ہیں، آنحضرت صلعم کی صحیح سنتوں اور آثار کے ترک کے جرم میں ماخوذ نہ ہوں گے؟ انہوں نے تو غلط بات کو صحیح بنانا چاہا تھا۔ مگر قرآن کی طرف دعوت دینے والے تو آج صحیح بات اور سچی تعلیم کو یک لخت برباد کر رہے ہیں۔ اور طرفہ یہ ہے کہ دونوں کا موضوع ایک ہی ہے۔ فرق صرف تعبیرات کا ہے۔ انہوں نے آج سے صدہا برس پہلے دین و مذہب کو دوسرے روپ میں بدلنا چاہا تھا اور آج مطالعہ حدیث تنقید صحیح کی روشنی میں کرنے والے بھی دین و مذہب کو تبدیل کرنا ہی ایک بڑی علمی خدمت سمجھ رہے ہیں۔

ہم ہر اُس شخص کا، جس نے احادیث و آثار کو پرکھنے کی استعداد بہم پہنچائی ہو، اور جو علمی تحقیق کی قابلیت رکھتا ہو، یہ حق تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں کہ وہ احادیث کے ذخیرہ پر تحقیق و تنقید کی نظر ڈالے اور ایک ایک روایت اور ایک ایک اثر کو اصول مسلّمہ کے مطابق جانچ کر دیکھے کہ آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اسکی نسبت صحیح ہے یا نہیں۔ ہمارا یہ مطالبہ ہرگز نہیں ہے کہ ہر وہ چیز جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے بیان کی جائے اس پر آمنا و صدقنا کہدیا جائے۔ جانچ پڑتال کرنے کا حق جس طرح پچھلے زمانہ کے اہلِ علم کو تھا اسی طرح آج کے اہلِ علم کو بھی ہے۔ مگر شترِ بے مہار بن کر سنن و آثار اور احادیث و اخبار نبوی کو یکسر ناقابلِ اعتبار بتانا علم اور تحقیق نہیں بلکہ جہالت اور ضد کے سوا کچھ نہیں ہے۔ غور کرو، آنحضرت صلعم کے زمانہ سے لیکر آج تک تمام محدثین اور ائمہ مجتہدین جو مذہبی و شرعی معاملات میں برابر

قرآن کریم کے بعد احادیث نبوی کو دلیل و حجت مانتے تھے کیا وہ سب معاذ اللہ جاہل ، اندھے اور انسان پرست مشرک تھے ؟ اور آج کے خانہ ساز مفسر ، مجتہد و محدث ان کے مقابلہ میں راستباز ، عالم اور پکے مسلمان ہیں ؟ کَبُرَتْ کَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ۔ اسلام اور محمد رسول اللہ صلعم کی امتیازی خصوصیت جو آج ساڑھے تیرہ سو برس سے قائم ہے گویا وہ محض افسانہ اور مصنوعی بات ہے - یہ مخصوص علمی تحقیقات اللہ تعالیٰ نے آجکل کے محققین و ماہرین اسرار کے لیے روز ازل سے اٹھا رکھی تھی جو ان فنا فی الکتاب حضرات پر اوپر سے نازل ہوئی ہے - حتیٰ کہ جو راز حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ ، عثمانؓ و حیدرؓ اور تابعین بالاحسان و ائمہ مجتہدین ابن حزمؒ ، ابن تیمیہؒ ، ابن قیمؒ ، بحر العلومؒ اور شاہ ولی اللہؒ پر نہ کھلے تھے وہ تنقید صحیح کی روشنی میں مطالعۂ حدیث کرنے والوں اور احادیث کو محض تاریخی حیثیت دینے والوں پر آشکارا ہوئے ہیں - یہ نادان احادیث نبوی کی مخالفت اور قرآن عظیم کی حمایت کے سلسلہ میں اتنا بھی نہیں سوچتے کہ اگر صحابہ اور تابعین اور ائمۂ مجتہدین اور تمام علماء اسلام اپنے دین کی بنیاد ایک غلط چیز پر رکھتے رہے ہیں تو کیا قرآن کی عملی تصویر دنیا میں کبھی قائم و جلوہ گر ہوئی ہی نہیں ؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو یہ چیز آخر کہاں ملیگی ؟ اور اگر یہ ابتدا ہی سے مفقود تھی تو قرآن اور محمد رسول اللہ صلعم سے زیادہ ناکام مشن تو دنیا میں کسی کا نہ رہا - بھلا کسی مسلمان کی غیرت اور ایمانی حرارت یہ ماننے کو ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا کر سکتی ہے کہ تیرہ سو برس سے تمام وہ لوگ جو اسلام کے ہیرو شمار ہوتے رہے ہیں ، جھوٹے اور جھوٹ بنانے والے اور جھوٹ پر دین کی بنا رکھنے والے قرار پائیں ؟

یہ چند سطریں زبان قلم پر بے ساختہ آگئیں جو لکھدی گئیں - ورنہ معلوم ہے کہ منکرین حدیث کو نہ تحقیق مطلوب ہے ، اور نہ وہ حق کو حق ماننے کے لیے تیار ہیں - نہایت سطحی معلومات

ہیں جن پر وہ اپنے علم و اجتہاد کا سکہ مغرب سے مرعوب نوجوانوں اور بے علم لوگوں میں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ بیشک انسانوں کے اصول اور تحقیقات میں غلطی کا امکان ہے۔ مگر ایسا امکان دنیا کے ہر علم و فن میں پایا جاتا ہے۔ پھر کونسا علم اور کونسا فن اس امکان کی وجہ سے ساقط الاعتبار قرار دیا گیا؟ آخر خصوصیت کے ساتھ علمِ حدیث ہی کو ان نوازشات کا ہدف کیوں ٹھیرایا گیا؟ کیا انصاف اور قدردانی و احسان شناسی کا تقاضا یہی ہے کہ جن لوگوں نے اپنا خون پانی ایک کر کے بعد کی نسلوں کے لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور سنت کو محفوظ کیا، اُن کی خدمات پر یوں پانی پھیرا جائے؟ اور کیا قرآن کی یہ آیت اب خارج از تلاوت و منسوخ الحکم ہو گئی ہے کہ: رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ؟

ہم نے یہ سلسلہ اس لیے شروع کیا تھا کہ اس راہ کی دیگر مشکلات کو خود سمجھیں نہ یہ کہ لوگ اس سے مستفید ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی تحقیق کسی کو پسند آجائے۔ اس پر ہم خدا کا مزید شکر ادا کرینگے۔ اور اپنی طالب علمانہ کمزوریوں کے لیے رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِیْنَا اَوْ اَخْطَأْنَا اور رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا کہہ کر بارگاہ رب العزت میں مزید ہدایت اور شرح صدر کی التجا کرینگے۔ جہاں سے سب کو ملا ہے وہیں سے ہم کو بھی ملیگا۔ والسّلام علیٰ مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی ۝

حقیقتِ نفاق

منافقین کی صفات اور انکی اقسام

(۶)

از جناب مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی

ان کی اُخروی زندگی کا حشر تو آپ سن چکے۔ آیئے اب اس امر پر غور کریں کہ امتِ اسلامیہ کو ان منافقوں کے ساتھ دنیا میں کس طرح پیش آنا چاہیے؟ ان کے ساتھ اس کے سیاسی، معاشرتی اور عمرانی تعلقات کی نوعیت کیا ہونی چاہیے؟ تو جیسا عرض کیا جاچکا ہے، اُخروی احکام کی طرح دنیوی احکام کے لحاظ سے بھی دونوں طبقوں کی نوعیت جداگانہ ہے۔

پہلے طبقہ کے بارے میں قرآن مجید کا بنیادی نقطۂ نظر یہ ہے کہ مومن تو اللہ کی پارٹی ہیں لیکن یہ منافق شیطان کی پارٹی ہیں اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَانِ (مجادلہ-۳) اس لیے خواہ یہ لاکھ اظہارِ ایمان کریں، امتِ اسلامیہ ـــــ یعنی حزب اللہ ـــــ سے ان کا کوئی رابطہ نہیں، یہ کبھی بھی ملت میں شمار نہ کیے جائیں:

وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ۔ (توبہ)

اور یہ منافق قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ وہ تمہاری جماعت میں ہیں حالانکہ وہ تم میں نہیں ہیں۔

بلکہ:-

هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ۔ (منافقون-۱)

یہ منافق تمہارے دشمن ہیں، ان سے خبردار رہو۔

کیونکہ دشمن سے کبھی بھی خیر کی توقع نہیں کی جاسکتی - بالخصوص ایسا دشمن جو دوست نما ہو - اس کی خطرناکیوں کا پوچھنا ہی کیا - ایسے دشمنوں سے کھلے دشمنوں (کفار) کی بہ نسبت دوچند خبردار اور متنبہ رہنے کی ضرورت ہے - پھر اس "فَاحْذَرْهُمْ" کی عملی صورت یہ بتائی گئی ہے کہ :-

فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ أَوْلِيَاءَ تو ان منافقوں میں سے اپنے ولی اور دوست

..... وَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ وَلِيًّا نہ بناؤ .... اور ان میں سے کسی کو اپنا

وَّلَا نَصِيرًا (النساء - ۱۲) دوست سمجھو اور نہ مددگار -

یعنی ان لوگوں سے کامل علیحدگی اختیار کرلینی چاہیے - انھیں اپنے معاشرتی، انتظامی، تعلیمی، اور سیاسی معاملات سے بالکل دور رکھنا چاہیے اور ان کا مکمل بائیکاٹ کرکے اپنی جماعت سے الگ کردینا چاہیے اس بائیکاٹ میں کسی مداہنت کو راہ نہیں دی جاسکتی - خصوصاً سیاسی معاملات میں نہ تو ان سے کوئی مشورہ لیا جاسکتا ہے، نہ اپنے رموزِ ملت و مملکت سے انھیں آگاہ کیا جاسکتا ہے - اور کسی معاملہ میں ان حضرات کی قیادت و رہنمائی قبول کرنے کا تو تصور تک نہیں کیا جاسکتا - چنانچہ اللہ تعالیٰ آنحضرت کو بار بار متنبہ کرتا ہے کہ :

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا اے نبی! اللہ سے ڈرو اور ان کافروں

تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ ۝ - اور منافقوں کی کسی بات کی پیروی نہ کرو -
(احزاب - ۱)

جب ایک مرتبہ کسی آزمایش میں ان کی منافقت، موقع پرستی اور سیہ باطنی بے نقاب ہوجائے تو حتی الوسع انھیں کسی جہاد میں عام مسلمانوں کے ساتھ نہ شریک کیا جائے، کیونکہ اگرچہ ان کی شرکت سے بظاہر مسلمانوں کی جمعیت بھاری اور ان کی قوت زیادہ نظر آئے گی، لیکن دراصل ان کی شرکت مفادِ اسلامی کے حق میں زہر ہوگی، اسلیے کہ وہ میدانِ جہاد میں بھی اپنی شرارتوں اور فتنہ انگیزیوں سے باز نہ آئینگے اور اسلامی جماعت کی کمزوری اور پراگندگی ہی کا سبب بنینگے -

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّ لَاَ اَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ (توبہ۔۷)، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کے بارے میں، جو غزوہ تبوک کے آلام و مصائب کا اندازہ کرکے گھر بیٹھ رہے تھے، حکم صادر کیا کہ:

"اے نبی اگر اللہ تعالیٰ تمہیں زندہ و سلامت ان منافقوں کے کسی گروہ میں واپس لے جائے اور یہ آئندہ کسی موقع پر جنگ کے لیے نکلنے کی اجازت مانگیں تو ان سے کہنا کہ تم میرے ساتھ کبھی بھی جنگ کے لیے نہ چلنے پاؤ گے اور نہ میرے ہمراہ کسی دشمن سے لڑنے پاؤ گے۔ تم نے پہلی مرتبہ (میرے ہمراہ جنگ کے لیے چلنے کے بجائے) گھر بیٹھ رہنے کو پسند کیا تو اب بھی پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔ (توبہ۔۱۱)

اور یہ حکم اس وقت اور موکد اور ضروری ہو جاتا ہے جب مقابلہ آسان ہو، تکالیف کا اندیشہ کم ہو اور نتیجۂ جنگ کے طور پر بہت کچھ فوائد حاصل ہونے کی توقع ہو۔ ایسے وقت میں منافق بڑی جانفروشی کا اظہار کرتا ہے، سراپا پیکر اخلاص بن جاتا ہے اور جنگ میں سب سے آگے آگے چلنے کی سعی کرتا ہے ـــ حالانکہ یہی ایمان کا جھوٹا مدعی کڑی آزمائشوں اور سخت قربانیوں کے وقت، اس سے پہلے، ہزاروں حیلے بہانے کرکے گوشۂ عافیت میں روپوش ہو چکا ہوتا ہے ـــ سو امام وقت کو چاہیے کہ ایسے لوگوں کو ہرگز ساتھ نہ چلنے دے، جیسا کہ سفر حدیبیہ سے پیچھے رہ جانے والوں کی نسبت اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کو حکم دیدیا تھا کہ خیبر کی سہل الحصول غنائم کے لیے جب تم نکلنا تو ان لوگوں کو ہرگز ساتھ نہ لے جانا (قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا) خواہ وہ اپنی اسلامیت کا لاکھ مظاہرہ کریں۔ ہاں اگر حقیقت میں ان کے دل بدل جائیں اور وہ واقعی اپنے کو مخلص ثابت کرنا چاہتے ہوں اور اپنے اندر ایمانی قوت پیدا کرکے اسلام پر جان نثار کرنے کے آرزومند ہوں اور محض فائدے کے لیے جنگ میں نہ جانا چاہتے

ہوں تو ان سے کہنا چاہیے کہ ابھی تو خاموش بیٹھو، تمہارے گذشتہ اعمال و اطوار تمہاری منافقت اور بزدلی کا فیصلہ دے چکے ہیں۔ اگر تم اس فیصلہ کو منسوخ کرانا اور اپنی سابق روش سے تائب ہو کر اپنے کمال ایمان اور خلوص اسلام کا ثبوت پیش کرنا اور اپنی پیشانی سے جبین نفاق کا کلنک مٹانا چاہتے ہو تو انتظار کرو ایک ویسی ہی سخت اور کڑی آزمائش کا جو عنقریب ایک قوی دشمن کے ساتھ مقابلہ کی شکل میں پیش آنے والی ہے۔ کیونکہ حقیقت تو اسی وقت واضح ہوگی اس وقت، جبکہ قربانیوں کا اندیشہ کم اور متاع دنیوی کے حصول کا قرینہ غالب ہے، تمہاری صحیح جانچ کا کوئی موقع نہیں۔ قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (فتح - ۲)

پھر ان سے الگ تھلگ رہنے میں اتنی شدید احتیاط برتنی چاہیے کہ اگر کبھی ان کی طرف سے بظاہر کسی نیک کام کی تحریک ہو تو بہتر یہ ہے کہ اس سے بھی تعاون نہ کیا جائے۔ اور اگر اس "نیک" تحریک کی تہ میں کوئی شیطنت جھلکتی نظر آجائے تب تو اس کی تمام تر ظاہری خوبیوں اور چمک دمک کے باوجود اس کی علی الاعلان سخت مخالفت کرنی چاہیے۔ دیکھیے مسجد کی حرمت مسلمان کی نگاہ میں کتنی زیادہ ہے اور اس کو بنانے اور آباد کرنے کی سعی کتنی مشکور اور محمود۔ مگر جب شیطان کے ایجنٹوں نے اسی مقدس اور محترم شئے کو اپنا آلہ کار بنانا چاہا اور نیکی و احسان کے بڑے بڑے دعووں کے ساتھ مسجد قبا کے مقابلہ میں ایک اور مسجد بنا کر کھڑی کر دی (دعوی یہ تھا کہ کمزور اور بوڑھے مسلمانوں کو رات کے اندھیرے میں زیادہ دور نہ جانا پڑے حالانکہ نیت صرف یہ تھی کہ مسلمانوں کی جماعت میں جو اتحاد اور ائتلاف موجود ہے اسے انتشار سے بدل دیا جائے) تو اللہ تعالی نے آنحضرتؐ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ مٹی

اور پتھر کی اس عمارت کو، جسے یہ منافق مسجد کہتے ہیں، نیکی کا مرکز نہ سمجھنا۔ یہ مسجد تو شر کا سرچشمہ ہے جسکی سوتیں عداوت حق کے جذبات سے پھوٹی ہیں، جسکی تعمیر غضب الہٰی کی سرزمین پر ہوئی ہے اور جس کا رُخ ٹھیک باب جہنم کی طرف ہے اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى .... اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِىْ نَارِ جَهَنَّمَ۔ (توبہ - ۱۳) اسی لیے اس مسجد کے نام اور اس کے احترام و تقدس کے دھوکے میں نہ آؤ۔ تمہیں اس سے کسی قسم کا تعلق نہ ہونا چاہیے یہانتک کہ اس میں تم کو کھڑا بھی نہ ہونا چاہیے لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا۔

اس ترک موالات کی آخری حد یہ ہے کہ ایسے منافقوں کی نہ تو نماز جنازہ پڑھی جائے اور نہ ان کے لیے دعائے مغفرت کی جائے:

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ۔ (توبہ - ۱۱)

اور ان منافقوں میں سے اگر کوئی مرجائے تو کبھی اسکی نماز جنازہ نہ پڑھو اور نہ اسکی قبر پر (دعائے مغفرت کرنے کیلیے) کھڑے ہو۔

اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منافقوں کی نماز جنازہ پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ عبداللہ ابن اُبَی جیسے منافق کی بھی آپ نے نماز جنازہ پڑھی۔ اسی موقع پر یہ حکم آیا اور اس کے آنے کے بعد آپ نے کسی منافق کی نماز نہیں پڑھی۔

یہاں تک جو احکام بیان ہوئے ہیں وہ ان تمام منافقین کے حق میں نافذ ہونگے جو اسلام اور کفر دونوں کی ماہیت سمجھنے کے بعد کفر کی پیروی اختیار کریں اور خفیہ یا علانیہ اسلام کے مقابلہ میں کفر کو تقویت دیں، اور اس کے باوجود اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے رہیں لیکن اس مقام سے آگے بڑھنے پر ایک سوال اور پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس عدم موالات کے باوجود بحیثیت ایک جماعت کے ان کے ساتھ ملت اسلامیہ کا سیاسی برتاؤ کس طرح کا ہوگا۔

کیا محض ان سے الگ تھلگ ہو رہنے اور انھیں اپنی جماعت سے خارج کر دینے ہی پر اکتفا کیا جائے گا یا کوئی اثباتی طرزِ عمل بھی اختیار کیا جائیگا؟ سو قرآنی احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لحاظ سے اس قسم کے منافقوں میں تفریق کی جائیگی۔ اگرچہ اپنی نفسانی خباثت اور اسلام دشمنی کے لحاظ سے تو یہ سب ایک ہی جماعت ہیں۔ لیکن جس طرح تمام کفار اپنے مشرکانہ عقائد اور کافرانہ اعمال کے لحاظ سے ایک ملت ہونے کے باوجود دو مختلف حیثیتیں رکھتے ہیں، یعنی بعض تو کھلے محارب قرار پاتے ہیں اور ان سے کسی قسم کا ربط و ضبط روا نہیں، اور بعض محارب اور مباح الدم نہیں ہوتے اور ان سے عام معاشرتی تعلقات رکھنے اور حسن سلوک سے پیش آنے کی اجازت ہے، اسی طرح ان درجۂ اول کے منافقین میں بھی فرق مراتب ہے۔ ایک تو وہ ہیں جو اسلام دشمنی میں حد سے بڑھے ہوئے اور اپنی سرگرمیاں اسلام کی بیخ کنی کے لیے وقف کیے ہوئے ہوں اور دن رات مسلمانوں پر تباہی لانے کی گھات میں لگے رہتے ہوں اور کفر و کفار کی علی الاعلان وفادارانہ خدمات بجا لا رہے ہوں۔ ان کے متعلق شروع میں اللہ تعالیٰ نے صرف یہ تنبیہ نازل کی تھی کہ:

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ	اگر یہ منافق اور وہ لوگ جنکے دلوں میں مرض ہے اور
فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ	مدینہ میں جھوٹی افواہیں اڑانے والے اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے
لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ	تو اے پیغمبر ہم تمہیں انکے خلاف ایکدن بھڑکا دینگے پھر وہ مدینہ
اِلَّا قَلِيْلًا ۚ مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا	میں تمہارے پڑوس میں چند دن سے زیادہ ٹھیرنے
وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا (الاحزاب - ۸)	نہیں پائینگے، ہر طرف سے ان پر پھٹکار پڑ رہی ہوگی

اور جہاں ملیں گے پکڑے جائینگے اور بری طرح قتل کیے جائینگے۔

کچھ مدت گذرنے پر یہ تنبیہ اور تہدید، جو مستقبل سے متعلق تھی، حالیہ احکام کی صورت

میں یوں نازل ہوئی :

فَإِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوكُمْ وَيُلْقُوا
إِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوا أَيْدِيَهُمْ
فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ
وَأُولَٰئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ
سُلْطَانًا مُّبِينًا ۔ (النساء - ۱۲)

اگر یہ فتنہ پرداز منافق تم سے کنارہ کش نہ رہیں، نہ تمہیں صلح و آشتی کا پیغام دیں اور نہ اپنے ہاتھوں کو روکیں تو انھیں پکڑو اور قتل کرو، جہاں بھی ملیں - اور (منافقوں میں سے) یہی وہ گروہ ہے جنکے اوپر ہم نے تمہارے لیے کھلی حجت دے دی ہے -

دوسری جگہ فرمایا گیا :

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ
وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۔

اے نبیؐ! کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔

(سورہ توبہ - ۱۱- نیز سورہ تحریم - ۲)

ان آیات میں منافقوں کی جو حیثیت بیان کی گئی ہے وہ ان کفار کی حیثیت سے ایک سرِ مو بھی مختلف نہیں ہے جو ملت اسلام کے خلاف برد آزما ہوں - پس ایک مسلمان کے لیے اس غیر مبہم فرمان الٰہی کی رو سے ضروری ہے کہ ہر اس شخص کے خلاف، جو معتبر قرائن کی بنا پر زیر بحث طبقۂ منافقین میں ہی شمار ہونے کے قابل ہو، اپنے سارے ذرائع سے اٹھ کھڑا ہو۔ امام جماعت پر فرض ہے کہ ان وجالوں کے خلاف اعلان جنگ کردے - ان پر سخت سے سخت جارحانہ کارروائیوں کا غیر مختتم سلسلہ شروع کردے - انہیں بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکے اور جماعت کو ایسے مہلک عناصر سے یکلخت پاک کردے - اسی طرح عام مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ ان سے ہر طرح کے تعلقات منقطع کرلیں - ان کے خلاف ہر ممکن ذریعۂ مجاہدہ اختیار کریں - ان کا سوسائٹی میں سانس لینا دوبھر کردیں - خصوصاً جو بدقسمت مسلمان اپنا

کوئی سیاسی مرکز اجتماع اور اپنا کوئی امیر نہیں رکھتے وہ توان ترکیبوں پر شدت سے عمل پیرا ہوں کہ "جہاد" اور "غلظت" کا مفہوم صرف تلوار تک محدود نہیں ہے۔ لیکن اگر نام نہاد مسلمان اپنے وطنی، نسلی، خاندانی، معاشی اور معاشرتی تعلقات کے مصالح کا لحاظ کر کے، یا ان دشمنوں سے فائدے کی امیدیں رکھ کر، یا ان کی طاقت سے مرعوب ہو کر مداہنت کو راہ دیں، تو انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ وہ کشتی کبھی بھی ساحل مراد پر نہیں پہنچ سکتی جس پر سوار ہونے والوں میں سے بعض لوگ اس میں سوراخ کر رہے ہوں اور دوسرے ان کا ہاتھ پکڑنے کے بجائے خاموشی سے طرح دیے جا رہے ہوں۔ رب العزت کی قسم ایسی کشتی ڈوب کر رہے گی اور صرف سوراخ کرنے والے ہی اس کے ساتھ نہ ڈوبیں گے بلکہ خاموشی سے تماشہ دیکھنے والے بھی موجوں کی نذر ہو جائینگے۔ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً۔

رہ گئے وہ منافق جو عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے تو اسلام سے پھرے ہوئے ہوں، اور جنہوں نے اسلام و کفر کے فرق کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد کفر ہی کی راہ اپنے لیے پسند کی ہو، مگر جو اسلام کے خلاف عملاً دشمنی نہ کرتے ہوں اور نہ اسلام کے دشمنوں کی اعانت کرتے ہوں، تو ان کے معاملہ میں اگرچہ بائیکاٹ اور عدم موالات کے ان تمام احکام پر عمل کیا جائیگا جن کا اوپر ذکر ہوا، لیکن انھیں محارب نہیں قرار دیا جائیگا اور نہ ان کے خلاف جہاد کیا جائیگا، جیسا کہ خود مذکورہ بالا آیات کے انداز بیان سے مستنبط ہوتا ہے۔ کیونکہ ان منافقوں کے خلاف تلوار اٹھانے کا حکم دیتے ہوئے اس شرط کا سب سے پہلے تذکرہ کر دیا گیا ہے کہ لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ (اگر یہ منافق اپنی سرگرمیوں سے باز نہ آئے) اور فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ (اگر یہ تمہاری مخالفت نہ چھوڑیں اور تم سے صلح کے طالب

نہ ہوں اور تمہارے مقابلہ سے اپنے ہاتھوں کو نہ روکیں)۔ اس کے علاوہ ایک مستقل آیت میں اسی طرح کے منافقوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ:

اُولٰئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا ۔ (النساء - ۹)	یہ وہ لوگ ہیں جنکے دلوں کے (منافقانہ) اسرار کو اللہ ہی خوب جانتا ہے، پس اے پیغمبر ان سے کوئی تعرض نہ کرو، انہیں ان کے انجام سے ڈرا کر نصیحتیں کرو اور دل نشین پیرایہ میں انھیں سمجھاؤ۔

تبلیغ حق اور تذکیر و ہدایت تو رحمۃ للعالمین کا واحد مشن تھا جسے آپ نے پتھروں کی بارش اور تلواروں کے سایہ میں بھی فراموش نہ کیا، اس لیے ان منافقوں کو بھی سچائی کی طرف بلانے پر آپ ہمہ وقت مامور رہتے۔ لیکن اس وعظ و پند اور ان کی نفاق پرستی سے صرفِ نظر کر لینے کا جو حکم دیا گیا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ کی حدود سے باہر ہیں یا لَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ کے حکم سے مستثنیٰ ہیں، یا لَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۔ کی عمومیت سے خارج ہیں۔ یہ ہیں تو بہر حال درجۂ اول کے منافق، لہٰذا سوشل بائیکاٹ کے احکام و ہدایات کے سلسلے میں تو یہ سرگرم عناد و قتال منافقوں کے ساتھ برابر کے رکھے جائینگے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ کی زد ان پر نہیں پڑتی۔ ورنہ باقی ہر حیثیت سے عام مسلمانوں کو اس قسم کے منافقوں سے عدم موالات کی اسی پالیسی پر عمل پیرا ہونا چاہیے جس کی توضیح سطور بالا میں کی جاچکی ہے۔ اگر مسلمان ایسا نہ کریں گے تو — خدا کی سنت کے مطابق — نفاق، کور باطنی اور بے ضمیری کا زنگ آہستہ آہستہ ان کے آئینۂ قلب پر بھی چڑھنے لگے گا اور ایک وقت آئیگا کہ ایمان کی ساری روشنی اس کے نیچے مستور ہو جائے گی۔

اس کے بعد دوسرے طبقہ کو لیجئے جو ضعفاء اور جہلاء پر مشتمل ہے۔ ان کے بارے میں قرآن زیادہ تفصیلات نہیں پیش کرتا۔ لیکن ایک جامع اصول اس نے ایسا بیان کر دیا ہے جو ہر تفصیل طلب امر کے سلسلے میں رہنمائی کے لیے کافی ہے۔ جو لوگ ایمان کا دعویٰ تو کرتے تھے لیکن ہجرت کی قربانی دینے کی تاب نہ لا سکے ان کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے کہ:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ (انفال - ۱۰)

جو ایمان تو لائے لیکن انھوں نے ہجرت نہ کی ان کی ولایت سے تمہارا کوئی تعلق نہیں جب تک کہ وہ بھی تمہاری طرح ہجرت نہ کریں۔ ہاں اگر دین کے معاملہ میں وہ تم سے مدد کے طالب ہوں تو تم پر ان کی مدد فرض ہے بشرطیکہ مدد کسی ایسی قوم کے خلاف نہ ہو جس سے تمہارا کوئی معاہدہ ہو چکا ہو۔

اس آیت میں ان کی حیثیت بالکل بے نقاب کر دی گئی ہے۔ اس بارے میں تو وہ دوسرے پختہ کار منافقوں ہی کی سطح پر ہیں کہ مسلمانوں کے وہ اولیاء نہیں ہو سکتے۔ لیکن اس اشتراک لفظی کے اندر بھی اختلاف معنی کی جھلک موجود ہے اور آیت کے مختلف ٹکڑے صاف بتا رہے ہیں کہ اس عدم موالات میں اور اُس قطع تعلقات میں جس کا طبقہ اولیٰ کے منافقوں کے بارے میں حکم ہوا ہے، بہت کافی فرق ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ ملت اسلامیہ میں شمار نہیں ہونگے، بعینہ اس طرح جس طرح کہ طبقہ اولیٰ کے منافقین ملت کے ارکان نہیں سمجھے جا سکتے۔ لیکن اس طبقہ منافقین کی طرح نہ تو ان پر سختی اور غلظت کی جائیگی نہ ان سے قتال کیا جائیگا نہ انھیں قتل اور گرفتار کیا جائیگا بلکہ اگر اُن کفار کے خلاف جنکے نرغہ میں وہ گھرے ہوئے ہوں، یہ امداد طلب کریں اور اس امداد کے ذریعہ حلقۂ کفر سے اپنے کو نجات دلانا اور حقیقی اسلامی زندگی بسر کرنے کے لیے آزاد ماحول پیدا کرنا

چاہیں تو امت اسلامیہ پر ان کی اعانت فرض ہے، بشرطیکہ کافروں کی وہ قوم جس کے خلاف یہ ضعفاء ایمان اعانت مانگ رہے ہیں، ملت اسلامیہ کی معاہد قوم نہ ہو۔ اسی طرح عام انسانی سلوک اور حسن معاشرت کے لحاظ سے یہ لوگ بہت زیادہ توجہ اور ہمدردی کے مستحق ہیں اور مسلمانوں کا اخلاقی فرض ہے کہ ان پا شکستہ اور کم ہمت انسانوں کو جو ایمان کی صبر آزما گھاٹیوں میں تھک کر بیٹھ جاتے ہیں، ہر ممکن سہارا دیں، انھیں ایمان کے مقتضیات سے بار بار آگاہ کریں، وعظ و پند کے ذریعہ انھیں ان کی زندگی کا حقیقی مشن اور انسانیت کا فرض منصبی یاد دلائیں، ضعف ایمان کے دنیوی اور اخروی خسران سے ڈرائیں۔ یہی حکمتِ عملی قرآن حکیم نے ان کے متعلق اختیار کی تھی۔ اس نے کبھی بھی ان سے لڑنے بھڑنے یا انھیں قتل کرنے یا ان سے یکسر تعلقات منقطع کر لینے کی تلقین نہیں فرمائی۔ بلکہ جب کبھی ان کو اس نے مخاطب کیا، ہر مرتبہ انہیں عذابِ آخرت کی ہولناکیوں کو یاد دلا کر متنبہ کیا کہ اس حالت سے، جو حالت نفاق ہے، نکلو اور پوری طرح شیوۂ تسلیم و رضا اختیار کرو ورنہ دوزخ کی سختیاں جھیلنے کے لیے آمادہ رہو۔ چنانچہ یہی آیت جس میں مکہ سے ہجرت نہ کرنے والے ضعفاء کا ذکر ہے، اس میں ان کے انجام کے متعلق قرآن نے صرف اتنا ہی کہکر خاموشی اختیار کر لی کہ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۔ اس کے آگے اس نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن اسی جگہ اگر سچے منافقوں کا تذکرہ ہوتا تو صرف اسی وعید پر اکتفاء نہ کی جاتی بلکہ مسلمانوں کو حکم دیا جاتا کہ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ (انھیں پکڑ پکڑ کر قتل کرو) جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ (کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان پر سختی کرو)۔ اور یہ جو انھیں بار بار عذابِ قیامت سے ڈرایا جاتا تھا تو اس کی حکمت یہی تھی کہ جن کے دلوں میں ایمان کی روشنی ہو وہ بالکلیہ کفر کی تاریکیوں سے نکل کر نور اسلام کی آغوش میں آجائیں اور ضعف

دارِ تباب کی خارزار سے نکل جائیں کہ رضائے الٰہی کے دارالسلام کے واقعی مستحق بن جائیں۔ پس یہی حکمت عملی آج بھی مسلمانوں کو اختیار کرنی چاہیے۔ ہاں یہ احتیاط رہے کہ مَالَكُمْ مِنْ وَّلَایَتِهِمْ مِنْ شَیْءٍ کا فرمان نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے، جو بے شمار حکمتوں اور دانائیوں کا حامل ہے۔ باوجود ہر طرح کی ہمدردی اور شدت اعتناء کے یہ لوگ اس کے سزاوار ہرگز نہیں ہیں کہ انھیں حزب اللہ کا رکن سمجھا جائے اور انھیں وہی ملی اور سیاسی حقوق دیئے جائیں جو حقیقی مسلمانوں کا حصہ ہیں۔ نہیں، نہ تو امت کے جماعتی حقوق سے یہ لوگ مستفید ہوسکتے ہیں، نہ انھیں نظم و نسق ملی میں کسی طرح شریک و سہیم بنایا جاسکتا ہے، اور نہ اسلامی رموز و مصالح کے بارے میں ان پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ اور ان میں سے کسی کو ملت کا قائد بنانے کا تو اس وقت تک تصور بھی نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ قومی و ملی تباہی اور ہلاکت کے محضر نامہ پر دستخط نہ کر دیئے جائیں۔

تیسرے طبقہ کا جس کا نفاق دراصل جہالت اور ناواقفیت پر مبنی ہے، اس سے ذرا مختلف حکم ہے۔ اس طبقہ کے لوگ جو اسلام سے ناواقف ہونے کے باعث کافرانہ خیالات اور کافرانہ طرز زندگی رکھتے ہیں، اور اسی ناواقفیت کی وجہ سے اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں ان کو محض ان کے ناموں اور ان کی پیدائش کا لحاظ کرکے مسلمان سمجھنا غلطی ہے۔ یہ دراصل اسکے مستحق ہیں کہ ان کے سامنے اسلام اسی طرح پیش کیا جائے جس طرح غیر مسلموں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ پہلے انھیں اسلام کے اصول و نظریات سے اچھی طرح باخبر کیا جائے اور واضح طور پر اسلامی صراط مستقیم اور غیر اسلامی سبیل الطاغوت کا فرق سمجھا دیا جائے پھر ان سے صاف صاف کہہ دیا جائے کہ یا تو اپنے دل و دماغ کو اسلام کے حوالے کردو اور زندگی کی ہر منزل میں اسلام جو ہدایت دے اس پر بے چون و چرا عمل کرو، ورنہ اسلام سے علٰحدگی کا کھلے طور پر اعلان کردو۔ اس کے بعد تمہیں اختیار ہے کہ اپنا

رشتہ چاہے مارکس اور لینن سے جوڑ دیا ہیگل اور ڈارون سے، اپنا کعبہ چاہے برلن یا ماسکو کو بناؤ یا لندن اور پیرس کا طواف کرو۔ پھر کسی مسلمان کو تم سے کوئی غرض نہ ہو گی۔ لیکن اس وضوح حق کے بعد بھی اگر وہ اپنی اسی دورنگی پالیسی پر چلتے رہیں، اور ایک پاؤں کشتی اسلام میں اور دوسرا کشتی کفر میں رکھ کر زندگی کا سفر طے کرنے کی کوشش کریں تو اس صورت میں مسلمانوں کا فرض ہے کہ بلا کسی رو رعایت کے ان کا پاؤں پکڑ لیں اور کشتی اسلام سے اسکو نکال پھینکیں۔

اسی طرح اِس طبقہ کے جو لوگ اسلام سے جاہل اور غیر اسلامی عقائد و اعمال کے پیرو ہونے کے باوجود محض "قومی" تعلق کی وجہ سے مسلمانوں کی دینوی ترقی اور سیاسی حقوق اور مادّی غلبہ کے لیے جدوجہد کرنے کے لیے اٹھتے ہیں، ان سے بھی مسلمانوں کو دھوکا نہ کھانا چاہیئے انکی کسی سیاسی یا عسکری یا تعلیمی تحریک سے مسلمان اپنی حقیقی منزلِ مقصود کو نہیں پہنچ سکتے۔ یہ ملت اسلام کے قائد بننے کے اہل نہیں، بلکہ اس کے مستحق ہیں کہ پہلے ان کے سامنے اسلام پیش کیا جائے، اور جب تک یہ ایمان لاکر احکام اسلامی کے آگے سر نہ جھکا دیں، ان کو قیادت تو درکنار، ملت کی صفِ اول میں بھی کھڑا نہ ہونے دیا جائے۔

یہ ہے نفاق کی حقیقت اور یہ ہیں منافقین کی علامتیں اور ان کے احکام۔ ہر مسلمان، جو اپنے کو مسلمان رکھنا اور کہلانا چاہتا ہے، اسے چاہیئے کہ اپنے مقامی حالات اور اپنے گردوپیش کے لوگوں پر نظر ڈال کر منافقوں کو پہچانے اور ان میں تمیز کرے اور اِن مطالبات قرآنی سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے۔ اس بارے میں، ملک، نسل، قوم، وطن، خاندان اور خون کے تعلقات یا وقتی مصلحتیں اسے مداہنت پر آمادہ نہ کریں۔ جو لوگ کسی مصلحت یا کسی کمزوری کی بنا پر منافقین کے ان طبقوں میں سے کسی طبقہ کے ساتھ مداہنت برتینگے وہ آخر کار خود اپنے ایمان کو خطرے میں ڈال دینگے۔

قرآن مجید کا طرزِ استدلال

از جناب مولوی حکیم محمد اسحاق صاحب کانپور

آفتاب کی روشنی، برف کی برودت، آگ کی حرارت اور اسی قسم کے دوسرے بدیہی حقائق و واقعات کے متعلق کبھی آپ نے اپنی قوت فکریہ کو دعوتِ نظر و فکر دی ہے، اگر جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو اسکی وجہ کیا ہے؟ وجہ بالکل ظاہر ہے کہ ان چیزوں کے علم و یقین کا حصول، استدلال و استنتاج کا محتاج نہیں ہے، بلکہ بغیر کسی نظر و فکر کے ہمارا ذہن ان اشیاء کا علم و یقین حاصل کر لیتا ہے۔

اس مثال سے اس حقیقت واقعی کی جانب اشارہ کرنا مقصود ہے کہ استدلال و تفکر خود مقصود بالذات نہیں ہے، بلکہ دراصل مقصود بالذات علم اور اذعان و یقین ہے دلائل و براہین تو محض اس مقصد کے حصول کے ذرائع اور وسائل ہیں جب ہمارے ذہن پر جہل، شک، اور وہم کی تاریکیاں مستولی ہو جاتی ہیں تو وہ فکر و استدلال کی شمع جلا کر اُن کو دور کرنا چاہتا ہے، اور جب علم و یقین کے نور سے منور ہو جاتا ہے تو اس شمع کو گل کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ حصول مقصود کے بعد ذرائع صرف بیسود ہی نہیں ہو جاتے، بلکہ "العلم حجاب اکبر" کے تحت داخل ہو کر اصل مقصد سے انسان کو غافل کر دیتے ہیں۔

اس ضروری اور مسلّم نکتہ کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے انسان کی قوتِ فکر غلط راستہ اختیار کر لیتی ہے جسکا نتیجہ ابدی گمراہی اور ضلالت ہے۔ وہی مسافر منزل تک پہنچ سکتا ہے

جو منزل کو مقصود بنائے ۔ اور جو مسافر راستہ کو مقصد قرار دے ، یا وسیلۂ سفر کا گرویدہ ہو، اُسکا منزل تک پہنچنا برات عاشقاں بر شاخِ آہو کا مصداق ہے جہلائے عرب نے اسی غلطی کا شکار ہو کر کہا تھا :

لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ
کیوں نہ اس نبی پر کوئی خزانہ اترا یا اسکے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا ؟

اگر وہ یہ سمجھتے کہ دلائل خود مقصود بالذات نہیں ہیں اس لیے انکی کسی خاص نوع پر زور دینا غایت درجہ کی سفاہت وحماقت ہے ، تو ایسی مہمل بات کبھی نہ کہتے ۔

عجیب بات یہ ہے کہ عرب کا وحشی جس ذہنی مرض میں آج سے ۱۳ سو برس پہلے مبتلا تھا اسی میں بیسویں صدی کی علمی فضا میں پرورش پانے والا یورپ کا فلسفی بھی مبتلا ہے اسکی غلطی کا منشا بھی بعینہٖ وہی ہے جو جہلائے عرب کی غلطی کا تھا اور اسکی گمراہی و ضلالت کا سبب بھی وہی ہے جو اس بدوی کی گمراہی کا تھا۔ فرق صرف مطالبہ کی نوعیت کا ہے عرب کا بدوی ، نبی اُمیّ فداہٗ ابی وامی کی صداقت کے لیے فرشتوں کی ہمرکابی اور سیم و زر کے انبار ضروری سمجھتا تھا۔ یورپ کا فلسفی اور اُسکا ہندوستانی متبع یہ نہیں طلب کرتا بلکہ منطق کی کسوٹی پر کسے ہوئے دلائل طلب کرتا ہے ۔ جب تک کسی مسئلہ پر منطقی دلیل نہ پیش کی جائے اس وقت تک وہ اسکو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے ۔ خطابیات سے کام لینے والے کو وہ لائق اعتنا نہیں سمجھتا۔ تمثیل اسکے نزدیک مردود ہے ۔ استقراء اسکی رائے میں ظنّی شے ہے ۔ شکل اوّل کے سوا اسکے نزدیک علم و یقین تک پہنچنے کی کوئی شکل نہیں ہے ۔

فن منطق کی تنقید ہماری بحث سے خارج ہے ۔ ہمیں فقط یہ کہنا ہے کہ یقین و اذعان کا تعلق انسان کے نفس سے ہے ۔ لہٰذا اسکا سرچشمہ خود انسان ہی میں تلاش کرنا چاہیے

علم کی خواہش انسان کی فطری خواہش ہے - اسکی فطرت نے منزل عرفان و ایقان تک پہنچنے کے لیے خود کچھ راہیں مقرر کی ہیں - ہمیں اُنہی راہوں کو تلاش کرنا چاہیے اور انہی پر چل کر اپنی اس فطری خواہش کو پورا کرنا چاہیے - استدلال کے نفسیاتی پہلو کو نظر انداز کر کے فقط اسکے ظاہری پہلو پر زور دینا ضلالت و گمراہی کا پیش خیمہ ہے - اگر ہر لمحہ اصل مقصد کو پیش نظر رکھا جائے تو اس غلطی سے حفاظت ہو سکتی ہے -

قرآن مجید سراپا رشد و ہدایت ہے - لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ - ادنیٰ درجہ کی غلطی کا صدور بھی اس سے ممکن نہیں ہے - اس لیے وہ ہمیشہ اصل مقصد کو پیش نظر رکھتا ہے اور ہر اس طریق استدلال سے کام لیتا ہے جو مقصد کے حصول میں مددگار ہو، قطع نظر اس کے کہ منطقی کی نگاہ میں اس کے استدلال کی کیا حیثیت قرار پاتی ہے - اسی وجہ سے قرآن کسی خاص طرزِ استدلال کا پابند نہیں ہے، بلکہ وہ فطرت انسانی کی طلب کا پابند ہے - انسانی فطرت مواقع اور معلومات کے تنوع کے لحاظ سے طریق استدلال میں تفنن چاہتی ہے اور علم و یقین کے کاخ بلند پر پہنچنے کے لیے مختلف مواقع پر مختلف زینے استعمال کرتی ہے - کتاب مبین اس کے اس فطری تقاضے کو قبول کرتی ہے اور اسی کے مطابق حجت و استدلال پیش کرنے میں تنوع اور تفنن پیدا کرتی رہتی ہے - قرآن کوئی خشک مزاج فلسفی نہیں ہے جو اپنی روکھی پھیکی اور بے محل تقریر سے مخاطب کے دل و دماغ کو ایک کشمکش میں مبتلا کر دے بلکہ وہ ایک شفیق و حکیم معلم ہے جو متعلم کو اسکے نفسیاتی و فطری راستہ سے علم و یقین کی منزل تک لے جانا چاہتا ہے - اس نے یہ دعویٰ کہیں نہیں کیا ہے کہ میں کوئی نئی چیز لیکر دنیا میں آیا ہوں، بلکہ وہ دعویٰ یہ کرتا ہے کہ میں ذکر اور تذکرہ ہوں یعنی خدا کی جو معرفت اور صراطِ مستقیم سے جو اُنس آدمی کی فطرت میں موجود ہے اسی کو میں

نمایاں کرنے آیا ہوں۔ اُسی بھولے ہوئے سبق کو یاد دلانا چاہتا ہوں جسکی بنا پر انسان نے اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کے جواب میں بلیٰ کہا تھا، جس کو وہ دنیا کی غفلت انگیز اور سکر آلود فضا میں آکر بھول گیا۔ قرآن کی رو سے انسان کی فطرت نہ تو جاہل ہے اور نہ گمراہ۔ اس کو علم اسی روز دیا گیا تھا جس روز اسے پیدا کیا گیا تھا۔ اسے فجور اور تقویٰ کی دونوں راہیں دکھا دی گئی تھیں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ مادہ اور مادیات کے حجابات کی وجہ سے آج وہ ذہول کے مرض میں گرفتار ہوگیا ہے۔ اس کا ذہن آئینہ کی طرح ہے۔ جو شے بھی اس کے سامنے آئیگی وہ اس میں مرتسم ہوجائیگی۔ مگر یہ آئینہ زنگ آلود ہوگیا ہے، اسلیے اسکو حقائق و معارف کا ادراک کرنے اور علم و یقین حاصل کرنیکے لیے صرف اسکی ضرورت ہے کہ اس آئینہ کے زنگ کو دور کردیا جائے۔ موانع اور حجابات معلومات کی جانب سے نہیں ہیں بلکہ خود متعلم کی جانب سے ہیں۔ اگر قلب پر سے غلاف اتار دیا جائے تو وہ پھر علوم و معارف کا گنجینہ بن جائیگا۔ فرقان حمید انہیں حجابات کو اٹھا دیتا ہے اور ذہنِ انسانی کے زنگ آلود آئینہ کو صاف کردیتا ہے۔ اُسکا کمال یہی ہے کہ وہ معلومات کو ذہنِ انسانی میں باہر سے ٹھونستا نہیں ہے بلکہ قلبِ انسانی پر انگلی رکھکر بتا دیتا ہے کہ یہ عقیدہ اس مقام پر تحریر ہے اور اس چیز کی شہادت یہاں موجود ہے۔ وہ استدلال میں ایسے ہی مقدمات لاتا ہے جنکی صداقت پر فطرتِ انسانی خود مہر تصدیق ثبت کرچکی ہے، اور انہیں فطری، واضح، اور بے خطر راستوں سے وہ انسان کو علم و یقین کی منزل تک لے جانا چاہتا ہے۔

ان راستوں کا تعدد کوئی چھپی ہوئی حقیقت نہیں ہے۔ صرف حواس ظاہرہ کی مثال ہی اس مسئلہ کی وضاحت کیلیے کافی ہے۔ ہمارے ہر حاسہ کے محسوسات جدا اور طرقِ احساس مختلف ہیں۔ آنکھ کسی اور طرح محسوس کرتی ہے اور کان کسی اور طرح۔ آنکھ کے

محسوسات اور ہیں اور کان کے اور۔ یہ تو معلومات کی صرف ایک نوع کی اقسام کا باہمی تفاوت ہے۔ دوسری انواع کے لیے وہ "قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا"۔ قرآن مجید جو فطرت سلیمہ کا ترجمان ہے اس اختلاف و تنوع کو کس طرح نظر انداز کر سکتا تھا۔ وہ علم و ہدایت کی منزل تک پہنچنے کے لیے انسان کے فطری و جبلی راستہ کے متوازی راستہ بناتا ہے۔ اس لیے علم و یقین کے فطری سرچشموں کو معلوم کر لینا قرآن مجید کے طرزِ استدلال کو معلوم کر لینے کے مترادف ہے۔ لیکن اسکے لیے تمہیداً چند امور کا جاننا ضروری ہے۔

گذشتہ بیان سے یہ تو واضح ہو گیا کہ انسانی فطرت خود تعقل و ادراک کی قوت رکھتی ہے۔ یہ ایک مسلّمہ امر ہے جسکے لیے کسی بیان کی حاجت نہیں ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ قدرت نے انسان کو قوت ادراک و تعقل عطا کیوں کی ہے؟ یا بالفاظ دیگر اس قوت کا صحیح مصرف کیا ہے؟

اس سوال کا جواب ہر شخص اپنے اپنے ذوق کے مطابق الگ الگ دیتا ہے ایک سائنسداں سے یہ سوال کرو تو وہ کائنات کے مواد و خواص اور قوانین قدرت کے کشف و ظہور کو عقل کا منتہائے نظر قرار دیگا۔ ایک فلسفی حقائق اشیاء کے علم کو قوتِ فکر کی معراج کہیگا۔ ایک سیاست داں اسرار حکمرانی معلوم کرنیکو اسکی غرض و غایت بتائیگا۔ مگر تم خود سمجھ سکتے ہو کہ یہ جوابات عقل انسانی کے دائرۂ عمل کو کسقدر تنگ کر دیتے ہیں؟ سفر زندگی میں قدم قدم پر ہم عقل کی رہنمائی کے محتاج ہیں اس لیے عقل کا تعلق ہماری زندگی کے کسی مخصوص شعبہ سے ہونا بالکل بعید از عقل ہے۔ اسکا دامن تو ہمارے وجود و بقاء کے دامن کے ساتھ بندھا ہوا ہے اور ہمارے وجود و بقاء کی ہر شاخ اسکے احاطۂ عمل میں داخل ہے۔ اس وسیع دائرہ کے حدود حصول منفعت اور دفع ضرر ہیں۔ یعنی فطرت انسانی اپنی قوت

تعقل و ادراک کو کسی نفع کی تحصیل یا کسی ضرر و نقصان کے دفع کرنیکے لیے استعمال کرتی ہے اور یہی اسکا مصرف ہے۔

اس اصول کی روشنی میں قوت عاقلہ کا فطری مقصد استعمال اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ انسان کی قوتِ فکر کی ہر وہ حرکت جسکی محرک خود فطرت انسانی ہو اسی مقصد کو پیش نظر رکھکر ہوتی ہے - اسلیے انسان نہج حرکت بھی ایسا ہی متعین کرتا ہے جو اسکے مقصد سے کوئی ربط و تعلق رکھتا ہو، اور ایسے مقدمات کو استعمال کرتا ہے جنکا تعلق اسکی کسی خاص منفعت سے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری فطرت علم و یقین حاصل کرنے کے لیے مندرجۂ ذیل راستے استعمال کرتی ہے :۔

اقتضاء فطری۔ اسکی شرح یہ ہے کہ انسانی فطرت جس شے کی طلب رکھتی ہے اسکے موجود ہونے کا یقین بھی ساتھ ہی اسکو حاصل ہوتا ہے، بشرطیکہ یہ طلب خالص فطری ہو، صنعت اور تکلف کو اس میں دخل نہ ہو۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسکے متعلق بداہتہ کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔ اس حقیقت کا یقین جس طرح ایک پا بہ گور بوڑھے کو ہوتا ہے اسی طرح ایک بچے کو بھی ہوتا ہے اور جس طرح ایک دقیقہ رس فلسفی اس حقیقت کا یقین رکھتا ہے اسی طرح ایک جاہل و سادہ لوح دہقان بھی اسکا اذعان رکھتا ہے۔ اسلیے کہ یہ حقیقت لوح فطرت پر جلی نقوش سے تحریر ہے اور فطرت انسانی کا اقتضاء ہر فرد میں یکساں ہوتا ہے مثلاً غذا کی خواہش ہماری فطری خواہش ہے، اسلیے ہمکو بدو طفولیت سے لیکر وقت نزع تک اس امر کا یقین رہتا ہے کہ دنیا میں غذا کے نام کی کوئی نہ کوئی شے ضرور موجود ہے۔ گو ہمکو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کیا ہے اور کہاں ہے۔ ایک بچہ پیدا ہوتے ہی اپنے دہن و گلو سے اس قسم کی حرکات کا اظہار کرتا ہے جو طلب غذا پر دلالت کرتی ہیں۔ اگر اسکو غذا کے وجود کا یقین

نہیں ہے تو اسکی ان حرکات کے کیا معنی ہیں؟ کیا کوئی علم النفس کا جاننے والا اس چیز کو تسلیم کرنیکے لیے تیار ہو سکتا ہے کہ کسی شئے کے وجود کو تسلیم کیے بغیر بھی اسکے حصول کی کوشش ہو سکتی ہے؟ یہ یقین بالکل فطری ہوتا ہے - البتہ اس بات کا علم کہ یہ مطلوب کہاں ہے اور کیا ہے، اس کا تعلق فطرت سے نہیں بلکہ عقل سے ہے اور اسکے لیے غور و خوض اور تلاش و جستجو کی حاجت ہوتی ہے -

غرض انسانی فطرت اس چیز کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ جس چیز کی اسکو خواہش ہو وہ موجود نہ ہو- کیونکہ اس کا اقتضاء غلطی پر مبنی نہیں ہو سکتا - دیکھو قرآن مجید نے اس فطری اصول استدلال سے کس طرح کام لیا ہے - وجود باری تعالیٰ پر استدلال کرتے ہوئے قرآن مجید کہتا ہے:

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وہ کون ہے جو مجبور کی دعا قبول کرتا ہے اور

وَیَكْشِفُ السُّوْٓءَ - تکلیف کو دور کرتا ہے -

استمداد انسان کا ایک فطری وصف ہے - وہ ایک ایسی شئے کا ہمیشہ طالب رہتا ہے جو اسکو اضطراب، پریشانی اور تکلیف سے نجات دیکر سکون و راحت سے ہم آغوش کر دے جب اطمینان و راحت کے کل اسباب منقطع ہو جاتے ہیں تب بھی اسکا یہ فطری اقتضاء باقی رہتا ہے - اور اس وقت وہ ایک ایسی ہستی سے فطرتاً آس لگاتا ہے جو فانی علل و اسباب سے بالاتر ہو اور ظاہری اسباب کی قیود سے آزاد ہو کر اسکے خوف و یاس کو امن و امید سے بدل دے - ظاہر ہے کہ وہی ہستی جو اسباب کی پابندیوں سے آزاد ہو خدا کے نام سے موسوم کی جاتی ہے - کتاب مبین کا منشاء یہ ہے کہ ایک ایسی ہستی کا تصور ہماری فطرت میں داخل ہے جو علل و اسباب کی قیود سے بالاتر ہو، جو مایوسوں کی امیدگاہ، پریشان و مضطر کی بناہ؟

اور بیکسوں کی فریاد رس ہو، اور جس کی قوت و طاقت کا دائرہ ہمارے دائرۂ تصور و خیال سے وسیع ہو۔ یہ ہماری فطرت کا اقتضا ہے جو غلط نہیں ہو سکتا اور یہ نقوش ہماری لوحِ فطرت پر ازل سے ثبت ہیں۔ یہ تو ممکن ہے کہ مادّی حجابات ان نقوش کو پوشیدہ کر دیں۔ لیکن یہ قطعاً محال ہے کہ کوئی قوت ان روشن نقوش کو مٹانا تو درکنار دھندلا بھی کر سکے اور قرآن یہی چاہتا ہے کہ ان دبے ہوئے نقوش کو ابھار دے۔

فرقان حمید نے ایک دوسرے فطری راستہ سے بھی انسان کو اس مقصد تک پہونچانے کی سعی کی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (جان لو کہ صرف اللہ ہی کی یاد سے اطمینان قلب نصیب ہوتا ہے) انسان فطرتاً صرف اُسی شے کے یقین کرنے پر مجبور نہیں ہے جسکا وہ فطرتاً خواہشمند ہوتا ہے، بلکہ وہ اُس شے کے وجود کا یقین کرنے پر بھی مجبور ہے جو اسکے فطری مقصد کے حصول میں معاون ہو۔ یہ فطرت کا دوسرا استنتاج ہے جس سے فرقان حمید نے یہاں کام لیا ہے۔

اطمینان قلب انسان کا ایک فطری مقصد ہے اور اتنا مہتم بالشان مقصد ہے کہ انسان اپنے کل افعال صرف اسی مقصد کے لیے انجام دیتا ہے۔ اس مقصد کا حصول محبت پر موقوف ہے۔ کیونکہ اطمینان نام ہے قلب کی یکسوئی اور ایک ہی جانب مائل ہو جانیکا اور اس کیفیت کا حصول صرف محبت ہی سے ہو سکتا ہے، اور عقلاً محبت صرف اُس شے سے ہو سکتی ہے جو ہر کمال سے متصف اور ہر عیب سے پاک ہو۔ ایسی ہی ذات کا نام خدا ہے۔

فطرت کے یہ طرقِ استدلال صرف ان معلومات کا اذعان و یقین حاصل کرنے کے لیے مفید ہو سکتے ہیں جنکے علم کے لیے کسی خاص صلاحیت و قوت کی حاجت نہیں ہوتی بلکہ ہر انسان اپنی سعی و کوشش سے ان کو حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن معلومات کی ایک دوسری قسم

بھی ہے جسکے علم کے لیے مخصوص صلاحیت و استعداد کی حاجت ہوتی ہے اور وہ خاص خاص اشخاص ہی میں پائی جاتی ہے، عام انسان اس سے خالی ہوتے ہیں۔ اس قسم کے معلومات کا علم و یقین ان انسانوں کو کس طرح حاصل ہوسکتا ہے جو کسی وجہ سے وہ قوت نہیں رکھتے؟ اسکی جانب ہماری روزمرہ کی زندگی رہنمائی کریگی۔

اگر مکۂ مکرمہ کی زیارت ہمکو نصیب نہیں ہوئی ہے اور ہم اسکے حالات و کوائف کے متعلق علم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہم اس کے حالات کسی ایسے شخص سے دریافت کرتے ہیں جو شرفِ زیارت حاصل کرچکا ہو۔ اگر ہم فن طب سے ناواقف ہیں تو ہمکو اپنی صحت اور اپنے مرض کے متعلق کسی طبیب کے فیصلہ پر اعتماد کرنا پڑتا ہے۔ اگر ہم فن تعمیرات کو نہیں جانتے تو ہم کو کسی انجنیر کی رائے پر یقین لانا پڑتا ہے۔ ان جزئیات سے ہم یہ کلیہ بنانے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ جن چیزوں کا علم آدمی کے اندر کسی مخصوص صلاحیت و استعداد کا طالب ہو، اور وہ صلاحیت کسی انسان میں نہ پائی جائے، تو ایسے شخص کے لیے ان کا علم حاصل کرنے کا فطری ذریعہ "خبر" ہے، یعنی جاننے والے کی دی ہوئی اطلاع۔ چونکہ یہ طریقہ ایک فطری طریقہ ہے اسلیے خارجی اشیاء مثلاً عمر، قوم، مرتبہ وغیرہ کے اعتبار سے اس میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ جسطرح ایک معمر شخص کا ذریعۂ علم خبر ہوتا ہے اسی طرح ایک بچہ بھی ایسی چیزوں کا علم اپنے بزرگوں سے پوچھ کر ہی حاصل کرتا ہے۔ جس طرح ایک جاہل دہقان ایسی اشیاء کا علم خبر سے حاصل کرتا ہے اسی طرح ایک عالی دماغ فلسفی بھی ایسے معاملات میں خبر پر ہی اعتماد کرتا ہے۔

کسی انسان سے اگر اسکی قوت و طاقت سے زائد بوجھ اٹھوایا جائے تو اسکے اعضاء کی شکل بگڑ جاتی ہے اور اسکی ہڈیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ ایک کمزور مریض کو اگر ثقیل غذائیں

کھلائی جائیں تو اسکی ہلاکت یقینی ہو جاتی ہے - اسی طرح اُن امور کا علم حاصل کرنے کے لیے ہماری جد و جہد، جنکی براہ راست تحصیل کی صلاحیت ہم میں نہیں ہے، اور جنکے حصول کا فطری ذریعہ صرف خبر ہے، نہ صرف یہ کہ ہم کو گمراہی و ضلالت میں مبتلا کر دیتی ہے، بلکہ اس سے ہمارے علمی و فکری قویٰ بھی طاقت سے زیادہ بار اٹھانیکی وجہ سے ماؤف ہو جاتے ہیں، اور آئندہ کے لیے ہم پر علم و یقین کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں - یہی وجہ ہے کہ جہاں قیامت اور حشر و نشر کا تذکرہ آیا ہے وہاں کتاب مبین نے اسکے امکان پر دلائل تو قائم کیے ہیں لیکن اسکے وقوع کو اور اسکی کیفیت کو دلائل سے ثابت نہیں کیا بلکہ اسکے لیے کتاب اور صاحب کتاب کی شہادت پیش کی ہے -

تم دیکھو گے کہ قرآن حکیم نے مسئلہ رسالت کو نہایت اہتمام اور کثرت و تکرار کے ساتھ بیان کیا ہے - اسکی وجہ یہی ہے کہ مسائل دین کے ایک کثیر حصہ کا علم خبر پر موقوف ہے - اسلیے قرآن مجید نے دین کی اس فطری بنیاد کو مستحکم و مضبوط کرنے کی کوشش کی ہے اس بنیاد کا استحکام دو چیزوں پر موقوف ہے - خبر کا امکان عقلی - مخبر پر اعتماد -

خبر کے امکان سے مراد یہ ہے کہ وہ اجتماع نقیضین کو مستلزم نہ ہو - اس سلسلہ میں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ کسی چیز کا مستبعد ہونا اور اس کا محال ہونا، یہ دونوں ہم معنی نہیں ہیں - یہ ایک عام غلطی ہے (جس میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ زیادہ مبتلا ہے) کہ مستبعد اور محال کو ایک ہی درجہ دیا جاتا ہے - بہت سی چیزیں ممکن ہیں مگر مستبعد ہیں - بہت سی چیزیں کل تک مستبعد تھیں مگر آج انکا وقوع ہو رہا ہے - مثلاً ریڈیو اور ہوائی جہاز وغیرہ - لہذا انسان کا کسی چیز کو بعید از عقل سمجھنا اس بات کی ہرگز دلیل نہیں کہ وہ ہو نہیں سکتی -

مخبر پر اعتماد کی یہ صورت ہے کہ اسکا صحیح العقل اور صادق ہونا معلوم ہو - اگر مخبر کا

صحیح العقل اور صادق ہونا یقینی ہے، اور اسکی خبر دائرۂ امکان سے باہر بھی نہیں ہے تو ہماری فطرت ہمکو مجبور کرتی ہے کہ ہم اسکی خبر پر یقین کریں۔ اگر ان شرائط کے باوجود ہم اسکی خبر میں شک کریں تو اسکے معنیٰ یہ ہیں کہ ہم اپنی فطرت کے خلاف جا رہے ہیں۔ اور فطرت کی مخالفت کرنے والے کی عقل و بصیرت کسی عقل والے کے نزدیک قابلِ اطمینان نہیں ہو سکتی۔

مسئلۂ قیامت کا تذکرہ تو ہم نے مثال کے طور پر کر دیا ہے، ورنہ قرآن مجید نے کیفیت یقین پیدا کرنیکا یہ روشن راستہ متعدد مقامات پر اختیار کیا ہے۔ اسی فطری طریق سے اُسنے انسان کو یوم الست کے بہت سے عہود و مواثیق یاد دلائے ہیں۔ لیکن یہی مثال وضاحت کے لیے کافی ہے۔ اس مثال پر غور کرو۔ قرآن حکیم نے قیامت کے امکان پر عقلی دلائل و براہین قائم کیے۔ مگر اسکے وقوع کے لیے اپنے اور رسول کے بیان کو کافی سمجھا۔ رسول کی صداقت کو بار بار ثابت کیا اور اس میں شک و ریب کے دونوں راستے مسدود کر دیئے، یعنی رسول کی فراست و دانشمندی کو دلائل قاہرہ اور براہین باہرہ سے ثابت کیا اور انکی صداقت و دیانت کو بھی روز روشن کی طرح عیاں کر دیا۔ اس فطری استدلال کے بعد حشر و نشر کے وقوع میں شک کرنیکی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ اور فطرت سلیمہ اسکے یقین کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

قرآن مجید کے کل طرق استدلال اور فطرت کے کل مناہج احتجاج کا بتانا یہاں مقصود نہیں ہے۔ یہاں تو نمونتہً چند چیزوں کو پیش کر دیا گیا ہے جن سے اس امر کا واضح کرنا مطلوب ہے کہ قرآنی طرزِ استدلال فطرت انسانی کے کس قدر مطابق ہے۔ قرآنی طرزِ استدلال سمجھنے کے بعد فرقان حمید کے پیش کردہ دلائل قاہرہ کا استحکام اور انکی عظمت کا صحیح احساس آسانی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ قرآنی دلائل کے مادّوں سے متعلق تھا۔ لیکن فطرت انسانی کے ساتھ قرآن مجید کی یہ ہم آہنگی محض مواد استدلال ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ

صورت دلیل پر بھی حاوی ہے۔ انسانی فطرت مختلف مواقع پر دلائل کی مختلف صورتوں کو مانگتی ہے کتاب مبین بھی اسکی طلب کا ساتھ دیتی ہے اور جس موقع پر جس صورت دلیل کی وہ مقتضی ہوتی ہے اس موقع پر یہ اسی صورت کو اختیار کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تم قرآن حکیم میں ہر ایک منطقی اور جدلی طرز استدلال کو پاؤ گے۔ یہ اقتدار فی نفسہٖ کوئی کمال نہیں ہے۔ قرآن حکیم کا کمال یہ ہے کہ اس نے جس موقع پر جو صورتِ دلیل اختیار کی ہے اُس موقع کے لیے اُس سے بہتر تو کیا اسکے مثل بھی کوئی صورت استدلال موزوں نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ جہاں جو صورت اختیار کرتا ہے وہاں فطرتِ انسانی بھی اس کے انتخاب کی داد دیتی ہے۔ نمونہ کے طور پر ذیل کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

حشر و نشر پر استدلال کرتے ہوئے قرآن مجید کہتا ہے

وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَأَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔

تم زمین کو دیکھتے ہو کہ سوکھی پڑی ہے۔ پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ ابھرتی اور پھولتی ہے اور ہر قسم کے خوشنما نباتات اگاتی ہے یہ سب اسلیے ہوتا ہے کہ صرف حق تعالیٰ ہی کی ہستی کامل ہستی ہے اور وہ مردوں کو زندہ کر دیتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

احتجاج مشرکین کے مقابلہ میں ہے۔ مشرک انتہائی وہم پرست ہوتا ہے بلکہ شرک خود قوت واہمہ کی مخلوق ہے۔ اگر مشرک عقل خالص سے کام لے اور اپنی قوت واہمہ کو مغلوب کرنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ شرک کی نجاستوں سے پاک ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید مشرک کی اس ذہنی پستی کو سمجھتا ہے اور اُسکو اس پستی سے نکالکر علم اور عقل کی بلندی کی طرف لیجانا چاہتا ہے اسلیے وہ نہ صرف یہ کہ دلیل کے مقدمات ایسے لاتا ہے جن میں فہم خالص کا کام ہو بلکہ صورت دلیل بھی ایسی اختیار کرتا ہے جس کو عقل خالص اور فہم محض آسانی کے ساتھ اور جلدی قبول کرلے تاکہ قوت واہمہ کا غلبہ دور ہو اور اس کی تاریکیوں میں گھری ہوئی عقل روشنی میں نکل کر حقیقت کا خود ادراک کرلے۔ ایسے موقع پر صورت

دلیل قیاس سے بہتر اور کون سی ہو سکتی تھی؟

مگر دوسری جگہ دیکھیے - جہاں نصاریٰ کے مقابلہ میں احتجاج کیا گیا ہے وہاں دلیل کو تمثیل کا لباس پہنایا گیا ہے - ارشاد ہے -

اِنَّمَا مَثَلُ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ آدَمَ - بے شک اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے -

ایک آسمانی کتاب ہاتھ میں رکھنے کے باوجود شرک میں گرفتار ہونا اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ مخاطب کی قوت واہمہ اسکی عقل پر اس درجہ غالب و مستولی ہو چکی ہے کہ اس میں خالص عقلی شئے کے سمجھنے کی صلاحیت ہی مفقود ہو گئی ہے - اس لیے ضرورت اس کی ہوئی کہ دوا اسی راستہ سے پہنچائی جائے جس راستہ سے مرض کے جراثیم داخل ہوئے ہیں اور جس راستہ سے اُنکے طبائع دلیل سے زیادہ اور جلدی متاثر ہو سکیں - اُنہوں نے حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا اسی لیے تو قرار دیا تھا کہ ان کا بے باپ کے پیدا ہونا انکے نزدیک عجوبہ تھا - لہذا ان کے اسی وہم کے راستہ سے دوا پہنچائی گئی کہ اگر عیسیٰ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے تو آدم تو ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے - پھر جب تم نے ان کو خدا کا بیٹا نہ قرار دیا تو عیسیٰ کے بارے میں کیوں ایسا غلط عقیدہ قائم کر لیا -

دیکھیے دونوں جگہ صورت دلیل موقع کے لحاظ سے کس قدر مناسب ہے اور مخاطب کی ذہنی حالت سے کیسی مطابقت رکھتی ہے -

مندرجہ بالا سطور سے قرآنی طرزِ استدلال و تفکر پر ہلکی سی روشنی پڑتی ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ دنیا کا طرزِ استدلال اور نہج فکر کسقدر غلط ، گمراہ کن اور فطری نہج فکر سے ہٹا ہوا ہے - گمراہی و ضلالت کا حقیقی سبب یہی نہج فکر اور طریق استنتاج کی غلطی ہے - اگر فطری طرزِ استدلال

و تفکر کو اختیار کیا جائے تو دنیا کا کوئی نظریہ قرآنی تعلیمات کے خلاف نہیں جاسکتا اور حیوانیت و بہیمیت کو وہ فروغ کبھی نہیں ہوسکتا جو آج دنیا میں ہو رہا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ آج خود مسلمان اسلامی نہج فکر کو چھوڑ کر غیر اسلامی طرز فکر اختیار کیے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ان کے پاس وہ کتاب موجود ہے جو صحیح اور فطری طرز فکر و استدلال کی تعلیم انسان کو دیتی ہے۔

معارف القرآن

مومنوں کی صفات

"مومن وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل کانپنے لگتے ہیں، اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو اُن کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے، اور وہ اپنے پروردگار ہی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز پابندی کے ساتھ قائم کرتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ یہی سچے اہلِ ایمان ہیں۔" (انفال - ۱)

"خوشخبری دے دو اُن نرم دل لوگوں کو جن کا یہ حال ہے کہ خدا کا ذکر سن کر ان کے دل کانپ جاتے ہیں، اور راہِ حق میں جو مصائب بھی پیش آجائیں ان کے مقابلہ میں وہ ثابت قدم رہتے ہیں، اور نماز پابندی کے ساتھ قائم کرتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں" (الحج - ۵)

"نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق یا مغرب کی طرف پھیرو۔ بلکہ نیک وہ ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور ملائکہ پر اور خدا کی کتاب اور اسکے پیغمبروں پر، اور جس نے اپنے محبوب اور پسندیدہ مال کو (نہ کہ ایسے مال کو جو اس کے دل سے اتر گیا ہو یا اسکے لیے بیکار ہو گیا ہو) خرچ کیا اپنے غریب رشتہ داروں پر اور یتیموں اور محتاجوں پر اور مسافروں اور سائلوں پر اور غلاموں کو آزادی دلوانے پر، اور جس نے نماز پابندی کے ساتھ قائم کی، اور جس نے زکوٰۃ ادا کی۔ اور نیک وہ ہیں کہ جب وہ عہد کریں تو اسے پورا کریں، اور تنگی و سختی اور جنگ کی حالت میں راہِ حق پر ڈٹے

رہیں- ایسے ہی لوگ (اپنے ایمان کے دعوے میں) سچے ہیں اور یہی متقی لوگ ہیں" (بقرہ - ۲۲)

"جو لوگ ایمان دار ہیں وہ سب چیزوں سے بڑھ کر اللہ سے محبت رکھتے ہیں" (بقرہ - ۲۰)

"تم یہ بات ہرگز نہ پاؤگے کہ جو لوگ ایمان لائے ہوں اللہ اور آخرت کے دن پر وہ محبت رکھیں اُن لوگوں سے جو اللہ اور اس کے رسول سے برسرِ پیکار رہوں خواہ وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں- اللہ نے ان کے دل میں ایمان کے نقوش ثبت کر دیے ہیں اور اپنی روح سے ان کو طاقت بخشی ہے- وہ ان کو ایسی جنتوں میں داخل کریگا جس کے نیچے نہریں بہتی ہونگی اور جس میں وہ ہمیشہ رہینگے- اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے- وہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں- اور دھیان رکھو کہ اللہ کی پارٹی والے ہی آخرکار فلاح پانے والے ہیں" (المجادلہ - ۳)

"محمدؐ رسول اللہ اور وہ لوگ جو ان کے ساتھی ہیں، ان کی خصوصیات یہ ہیں کہ وہ کافروں کے مقابلہ میں تُند اور آپس میں نرم خو ہیں- تم جب ان کو دیکھوگے یا تو رکوع اور سجدہ کرتے ہوئے پاؤگے یا اللہ تعالیٰ کا فضل اور اسکی رضامندی حاصل کرنے کی جدوجہد میں مشغول پاؤگے- ان کے چہروں پر سجدے کے نشان ہونگے" (الفتح - ۴)

"مومنوں کا کام یہ ہے کہ جب ان کو اللہ اور رسول کی طرف بلایا جائے تاکہ رسول ان کے معاملات میں فیصلہ کرے، تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی- ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں- جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اور اللہ سے ڈرے اور اسکی نافرمانی سے بچے وہی کامیاب ہے" (النور ۲)

"اللہ ان ایمان دار لوگوں کا اجر ضائع نہ کریگا جنہوں نے زخم خوردہ اور مصیبت زدہ ہونے کے باوجود اللہ اور اسکے رسول کی طلب پر لبیک کہا- ان میں سے جو لوگ نیکوکار اور پرہیزگار رہیں ان کے لیے بڑا اجر ہے- جن کا حال یہ ہے کہ لوگوں نے جب ان سے کہا کہ تمہارے مقابلہ میں فوجیں اکٹھی ہو گئی ہیں اُن سے ڈرو، تو اُن کے ایمان اور بڑھ گئے اور انہوں نے کہا کہ ہمارے لیے اللہ کافی

ہے اور وہی بہترین پاسبان ہے"۔ (آل عمران - ۱۸)

"جو لوگ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں وہ تم سے کبھی درخواست نہ کرینگے کہ راہِ خدا میں اپنی جان و مال کے ساتھ جہاد کرنے سے انہیں معاف رکھا جائے۔ اللہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو اس سے ڈرتے ہیں۔ اس طرح کی درخواستیں تو وہی لوگ کرتے ہیں جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے اور جن کے دلوں میں شکوک ہیں اور جو اپنے ان شکوک ہی میں متردّد ہو رہے ہیں"۔ (التوبہ - ۷)

"اے مسلمانو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ عنقریب ایسے لوگ پیدا کریگا جو اللہ سے محبت کرنے والے ہونگے اور اللہ ان سے محبت کریگا۔ وہ مومنوں کے مقابلہ میں نرم اور کافروں کے مقابلہ میں مضبوط اور خوددار ہونگے، اللہ کی راہ میں جہاد کرینگے، اور دین کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرینگے"۔ (المائدہ - ۸)

"مومن وہ ہیں جو اللہ اور اسکے رسول پر ایمان لائے اور پھر اس میں شک نہ کیا، اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں اپنی جان اور مال سے جہاد کیا۔ ایسے ہی لوگ سچے ہیں"۔ (الحجرات - ۲)

"دوڑو اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمانوں اور زمین جیسی ہے اور جو مہیا کی گئی ہے اُن پرہیزگاروں کے لیے جو خوشحالی اور بدحالی دونوں حالتوں میں اپنے مال نیک کاموں پر خرچ کرتے ہیں، جو غصّہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کے قصور معاف کرتے ہیں۔ اللہ ایسے ہی نیکوکاروں کو پسند کرتا ہے۔ اور جن کا حال یہ ہے کہ جب اُن سے کوئی بے حیائی کی بات یا کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو فوراً اللہ ان کو یاد آجاتا ہے اور وہ اس سے اپنے قصوروں کی معافی مانگتے ہیں کہ اللہ کے سوا کون قصور معاف کرنے والا ہے۔ وہ اپنے فعل پر جانتے بوجھتے اصرار نہیں کرتے"۔ (آل عمران - ۱۴)

"وہ اللہ کی محبت میں کھانا کھلاتے ہیں محتاج اور یتیم اور قیدی کو، اور کہتے ہیں کہ ہم تمہیں محض خدا کی خاطر کھلاتے ہیں، تم سے کسی بدلے یا شکریہ کے خواہشمند نہیں ہیں - ہم کو تو اپنے رب سے اس دن کا خوف ہے جو نہایت اُداسی اور سختی کا دن ہوگا" (الدہر - ۱)

"وہ فلاح پائی ان مومنوں نے جو اپنی نماز خشوع کے ساتھ ادا کرتے ہیں، جو بیہودہ کاموں سے الگ رہتے ہیں، جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں —— بجز اپنی بیویوں اور اُن عورتوں کے جو اُن کے قبضہ میں ہوں کہ ان سے تعلق رکھنے میں وہ قابلِ ملامت نہیں ہیں، البتہ اس حد سے تجاوز کرنے والے گناہ گار ہیں —— جو امانتوں اور اپنے عہدوں کی نگہداشت رکھتے ہیں، اور جو اپنی نمازوں کے پابند ہیں - یہی لوگ فردوس کے وارث بننے والے ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہینگے" (المومنون - ۱)

"رحمان کے بندے وہ ہیں جو زمین میں انکسار و فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے خطاب کرتے ہیں تو وہ سلام کرکے ان سے الگ ہو جاتے ہیں، جو راتوں کو اپنے رب کی عبادت میں سجدہ اور قیام کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے پروردگار ہم کو جہنم کے عذاب سے بچا کہ اس کا عذاب جان کا لاگو ہے اور وہ بُری جگہ ہے ٹھیرنے کی اور بُری جگہ ہے رہنے کی، جو خرچ کرتے ہیں تو اس میں نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل بلکہ دونوں کے درمیان سیدھی راہ اختیار کرتے ہیں، جو اللہ کے سوا کسی معبود کو نہیں پکارتے، اور کسی ایسی جان کو جسے اللہ نے حرام کیا ہے حق کے بغیر ہلاک نہیں کرتے، اور زنا نہیں کرتے —— اور جو زنا کرے وہ گناہ میں مبتلا ہوگا، قیامت کے روز اسکو دوگنا عذاب ہوگا، وہ رسوائی میں مبتلا رہیگا، البتہ جس نے زنا کرکے توبہ کرلی ہو اور ایمان لاکر نیک عمل اختیار کرلیا ہو، ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ بھلائی سے بدل دیگا کیونکہ اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے" اور جو شخص توبہ کرکے نیک عملی اختیار کرلیتا ہے وہ اللہ کی طرف پلٹ آتا ہے —— اور رحمان کے نیک

بندے وہ ہیں جو جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے، اور جب بیہودہ کاموں پر سے گذرتے ہیں تو شریف آدمیوں کی طرح گذر جاتے ہیں، اور جب ان کو ان کے پروردگار کی ہدایات سنائی جاتی ہیں تو وہ ان کے لیے اندھے اور بہرے نہیں بن جاتے، اور جو اپنے رب سے دعا کرتے ہیں کہ پروردگار! ہم کو اپنی بیویوں اور بچوں کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا کر اور ہمیں پرہیزگاروں کا پیشوا بنا دے۔" (الفرقان - ۶)

"مگر وہ نماز پڑھنے والے جو ہمیشہ اپنی نمازوں کے پابند رہتے ہیں، اور جن کے اموال میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے، اور جو یوم جزا کو سچ مانتے ہیں، اور جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں کہ اسکے عذاب سے بچنے کی کوئی صورت نہیں، اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں ــــ سوائے اپنی بیویوں اور ان عورتوں کے جو اُن کے قبضہ میں ہیں کہ ان سے تعلق رکھنے میں وہ قابلِ ملامت نہیں ہیں، البتہ اس حد سے آگے بڑھنے والے گناہ گار ہیں ــــ اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہدوں کی نگہداشت رکھتے ہیں، اور جو سیدھی صاف گواہی دینے والے ہیں، اور جو اپنی نمازوں کو ٹھیک وقت پر باقاعدہ ادا کرتے ہیں، وہی عزت کے ساتھ جنتوں میں رہینگے۔" (المعارج - ۱)

"اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے ساتھی اور مددگار ہیں۔ وہ نیکی کا حکم کرتے ہیں اور بدی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ ان لوگوں پر اللہ کی رحمت ہوگی۔ اللہ زبردست اور دانا ہے۔" (التوبہ - ۹)

"اللہ نے مومنوں سے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو خرید لیا ہے اس معاوضہ میں کہ اُنکے لیے جنت ہے۔ وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں، پھر مارتے بھی ہیں اور مارے بھی جاتے ہیں (اُن کو جنت دینے کا) وعدہ سچا ہے جو توراۃ اور انجیل اور قرآن میں کیا گیا ہے، اور اللہ سے بڑھ کر کون ہے جو اپنے عہد کو پورا کرنے والا ہو۔ لہٰذا تم اس بیع کے معاملہ پر خوش ہو جاؤ جو تم نے کیا ہے، اور یہ بڑی کامیابی ہے۔ تم توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، خدا کی حمد و ثنا کرنے والے،

خدا کی میں راہ میں سفر کرنے والے، رکوع اور سجدہ کرنے والے، نیکی کا حکم اور بدی سے منع کرنے والے، اور اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں کی حفاظت کرنے والے ہوں۔ اور اے نبی خوشخبری سنادو ان مومنوں کو جو ایسے ہیں"۔ (التوبہ - ۱۴)

"کیا وہ شخص جو رات کی تاریکیوں میں خدا کے احکام کا مطیع رہے، اُسکے آگے سربسجود ہو اور اُس کی عبادت میں کھڑا رہے، اور جو آخرت کا خوف رکھتا ہو اور اللہ ہی کی رحمت کا امیدوار ہو (کیا اس کا حال ان کے مانند ہو سکتا ہے جو ایسے نہ ہوں ؟) کیا وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں، اور وہ جو علم نہیں رکھتے، دونوں برابر ہو سکتے ہیں ؟ ...... جو طاغوت کی بندگی سے پرہیز کرتے ہیں، اور بس خدا ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں اُن کے لیے خوشخبری ہے۔ پس اے نبی! مژدہ سنادو میرے اُن بندوں کو جو بات کو سنتے ہیں اور اسکا بہتر پہلو لے کر اسی کی پیروی کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے اور یہی لوگ صحیح عقل رکھنے والے ہیں"۔ (الزمر - ۱ - ۲)

"بے شک وہ مرد اور وہ عورتیں جو مسلم ہیں، مومن ہیں، فرماں بردار ہیں، سچے ہیں، مشکلات میں راہِ حق پر ثابت قدم رہنے والے ہیں، خدا کے آگے عاجزی سے جھکنے والے ہیں، صدقہ دینے والے ہیں، روزے رکھنے والے ہیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، اللہ کو بہت یاد کرنے والے ہیں، اُن کے لیے اللہ نے مغفرت اور بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔ اور کسی مومن مرد یا عورت کا یہ کام نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ میں اپنا فیصلہ دے چکا ہو تو پھر وہ اپنے اُس معاملہ میں خود مختار ہوں"۔ (الاحزاب - ۵)

"جو سچی بات لے کر آئے، اور جو سچی بات کو سُن کر تسلیم کرے، ایسے ہی لوگ پرہیزگار ہیں"۔ (الزمر - ۴)

"وہ آخرت کا گھر تو ہم نے اُن کے لیے رکھا ہے جو زمین میں اپنی بڑائی قائم کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے اور نہ فساد برپا کرتے ہیں۔ آخری انجام کی بھلائی ایسے ہی پرہیزگاروں کے لیے ہے"۔ (القصص - ۹)

"یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں، اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں، جو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے، ہر حال میں خدا کا خیال رکھتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی ساخت میں غور وفکر کرتے ہیں۔ (انکا دل اندر سے پکارتا ہے کہ) پروردگار! تو نے یہ سب کچھ لاحاصل اور بے نتیجہ پیدا نہیں کیا ہے، تو پاک ہے اس سے کہ بے مقصد اور عبث کام کرے۔ ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔ پروردگار! تو نے جسکو آگ میں داخل کیا اسے رسوا کردیا اور ظالموں کا پھر کوئی مددگار نہیں۔ پروردگار! ہم نے ایک پکارنے والے کی پکار سنی کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر، اور ہم اس پر ایمان لے آئے۔ پروردگار! اب تو ہمارے گناہ بخش دے اور ہماری برائیوں کا وبال ہم پر سے اتار دے، اور ہمارا انجام نیکوں کے ساتھ کر۔" (آل عمران - ۲۰)

"اللہ کی مسجدوں کو آباد وہ کرتے ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور جنہوں نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ دی اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرے۔ ایسے ہی لوگ راہ راست پر چلنے والوں میں ہیں۔ کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے والے اور مسجد حرام کی مجاوری کرنیوالے لوگوں کو انکے برابر سمجھ رکھا ہے جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان لاتے اور خدا کی راہ میں جہاد کرتے ہیں؟ اللہ کے نزدیک تو یہ برابر نہیں ہیں، اور اللہ ظالموں کو راہ راست نہیں دکھاتا۔ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے خدا کی راہ میں اپنے گھر بار چھوڑے اور اسکی راہ میں اپنی جان و مال سے جہاد کیا، اللہ کے نزدیک تو انہی کا درجہ بڑا ہے اور وہی کامیاب ہیں۔ انکا پروردگار انکو اپنی رحمت اور اپنی خوشنودی کا اور ایسی جنتوں کا مژدہ سناتا ہے جس میں ہمیشہ باقی رہنے والی نعمتیں ہونگی اور جن میں وہ ہمیشہ رہینگے۔ اے ایمان لانے والو، اگر تمہارے باپ اور بھائی بھی ایمان کے مقابلہ میں کفر کو محبوب رکھتے ہوں تو تم ان سے بھی محبت کا تعلق نہ رکھو۔ تم میں سے جو کوئی ان سے تعلق رکھیگا اسکا شمار ظالموں میں ہوگا۔ اے نبی! مسلمانوں سے کہدو کہ اگر تمہیں اپنے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور رشتہ دار اور اپنے کمائے ہوئے مال اور اپنی تجارتیں (جن میں نقصان آجانیکا تم کو خوف ہے)، اور اپنے گھر بار (جو تم کو پسند ہیں) اللہ اور اس کے رسول اور اسکی راہ میں جہاد کرنے کی بہ نسبت زیادہ عزیز ہیں، تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر کرے۔ اللہ بدکار نافرمان لوگوں کو راہ راست نہیں دکھاتا۔" (التوبہ - ۳)

اِقتباسات

یوگوسلاویہ میں مسلمانوں کا شرعی نظام

شمالی یوگوسلاویہ میں بوسنیا اور ہرزیگوڈینا سے جنوبی یوگوسلاویہ یعنی مقدونیا اور اسکا بلچ تک مسلمانوں کی آبادی ہے۔ ہر جگہ انکی مساجد ہیں۔ مدارس ہیں اور محاکم شرعیہ ہیں مسلمانوں کے علاوہ وہاں سلاوی، کروٹ، رومانی، ہنگری اور جرمن اقلیتیں بھی آباد ہیں۔ کل آبادی ڈیڑھ کروڑ افراد پر مشتمل ہے جس میں سترہ لاکھ مسلمان ہیں۔ اس وقت وہاں کا نظام جمہوری ہے۔ مگر ۱۹۲۰ء میں جب وہاں ڈکٹیٹرشپ قائم تھی انتخابات میں مسلمانوں نے بیس۲۰ نشستیں حاصل کی تھیں اور وزارت میں بھی چار مسلمان وزیر لیے گئے تھے۔

اس وقت وہاں جمہوری نظام میں مختلف سیاسی جماعتیں کام کر رہی ہیں جن میں ریڈیکل پارٹی بھی ہے، جمہوریت پسند بھی ہیں اور مزارعین بھی۔ کابینہ میں دو وزیر مسلمان ہیں جن میں ایک ڈاکٹر محمد صباحو وزیر مواصلات ہیں۔

یوگوسلاویہ کے دارالحکومت بلغراد میں مسلمانوں کے مذہبی مسائل کا تصفیہ کرنے کے لیے محکمۂ شرعیہ قائم ہے۔ اور اس شرعی نظام سے یوگوسلاویہ کے تمام مسلمان وابستہ ہیں۔ قابلِ لحاظ چیز یہ ہے کہ وہاں مسلمانوں کو پورے طور پر مذہبی آزادی اور تہذیبی خود مختاری حاصل ہے جس میں نہ تو افراد اور جماعتیں مداخلت کر سکتی ہیں، نہ خود حکومت در انداز ہو سکتی ہے۔ انکی تہذیب اپنی تہذیب ہے۔ کسی دوسری تہذیب کو ان کے سر چیپکنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ان کے مذہبی معاملات پر کسی قسم کی پابندی

عائد ہے اور نہ وہاں کی پارلیمنٹ کو ان کے قوانین میں ردّو بدل کرنے کا اختیار حاصل ہے - ان کے معاملات ان کے اپنے اختیار میں ہیں - خصوصاً اوقاف کی آمدنی اور ان کا انتظام -

یوگوسلاویہ میں مسلمانوں کے لیے خود اپنے قوانین اور دستور ہیں - قیام جمہوریت کے بعد ۱۹۳۶ء میں وہاں کی جمعیتہ علماء نے مسلمانوں کے لیے ایک مذہبی اور تہذیبی دستور مرتب کیا جس کو ملک کی حکومت اور پارلیمنٹ نے تسلیم کر لیا - اس دستور کی رو سے جماعت اسلامیہ کو اوقاف اور شرعی مقدمات کے تصفیے کا حق حاصل ہے - اسی کو ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ مذہبی مدارس پر قبضہ حاصل ہے اور سرکاری مدارس میں بھی اسی کی بدولت مذہبی تعلیم مسلمانوں کے لیے جبری ہے اور اس کی نگرانی بھی اسی جماعت کے ذمّے ہے - حکومت مسلمانوں کے دستور و معاملات میں سوائے نگرانی کے کوئی مداخلت نہیں کر سکتی - کیونکہ تمام مذہبی شعبوں پر مسلمانوں کا اپنا قبضہ ہے اور وہی ان کا اہتمام و انصرام کرتے ہیں - یوگوسلاویہ میں اسلامی امور کے انتظام و انصرام کے لیے پانچ ادارے قائم ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

(۱) پہلے ادارے کا نام مجلس الجماعات ہے - چونکہ یوگوسلاویہ کے مسلمان جماعتوں میں منقسم ہیں جنکی تعداد چار سو کے قریب ہے اس لیے یہ جماعت تمام مسلم قبائل کے ابتدائی امور کی نگرانی کرتی ہے - مثلاً پیدائش ، اموات اور نکاح کا رجسٹر اس کے قبضے میں ہوتا ہے اور وہی ان کی غور و پرداخت کرتی ہے - مسلمانوں کی ہر جماعت پر ایک امام مقرر ہے جسے ملکی خزانے سے تنخواہ ملتی ہے

(۲) دوسرا ادارہ مجلس مرکزیہ کے نام سے موسوم ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ ہر شہر ، ہر قصبے اور گاؤں میں اوقاف کی نگرانی کے لیے انجمن قائم کرے - یہ مرکزی ادارہ قرب و جوار کے تمام اوقاف کا نگراں ہے اور اوقاف کا حساب و کتاب بھی اسی کے ذمّے ہے -

(۳) تیسرا ادارہ جمعیتہ علماء ہے - جس کا مرکز سراجیفو اور اسکوپ میں ہے - ہر جمعیتہ علماء چار

ارکان پر مشتمل ہوتی ہے جنھیں علمار کرام کی ایک مجلسِ خاص منتخب کرتی ہے اور اس مجلس خاص کے ارکان میں مجلس اوقاف کے ارکان لیے جاتے ہیں جن کا انتخاب مسلمانوں کی طرف سے ہوتا ہے۔

جمعیتہ علماو کے فرائض کی تحدید از روئے قانون ہوتی ہے یعنی مسلمانوں کی مذہبی، اجتماعی تہذیبی زندگی کی نگرانی اور اسلامی اداروں کا اہتمام و انصرام۔

(۴) چوتھا ادارہ مجلس الاوقاف کے نام سے موسوم ہے جس کے مرکزی دفتر سراجیفو اور اسکوپ میں ہیں۔ اس ادارے کا کام یہ ہے کہ وہ اوقاف کے مالیات کا اہتمام و انتظام کرے۔ صدر مجلس اوقاف کو ملکی خزانہ سے مشاہرہ ملتا ہے۔

(۵) پانچواں ادارہ رئیس العلمار یا صدر جمعیتہ العلمار کا ہے جو باقاعدہ حکومت کا عہدیدار ہوتا ہے اور حکومت ہی سے تنخواہ پاتا ہے۔ انھیں سواری کے لیے موٹر بھی حکومت سے ملتی ہے اور فوجی سلامی بھی دی جاتی ہے۔ اس وقت رئیس العلمار کے منصب جلیلہ پر فہیم آفندی سپاہو فائز ہیں جو ڈاکٹر محمد سپاہو وزیر مواصلات کے بھائی ہیں۔

مجلسِ علمار ان تمام اداروں کے ذریعے سے مسلمانوں کے مذہبی اور اجتماعی فرائض انجام دیتی ہے اور تمام اداروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی کارروائیاں مجلس علمار کے پاس بھیجیں اور ہر معاملے میں اس سے استصواب و استشارہ کریں پھر مجلس علمار نے بھی تقسیم کار کے اصول پر چار شعبے قائم کر رکھے ہیں:-

(۱) پہلا شعبہ دار الافتار ہے جس کا کام صرف یہ ہے کہ مذہبی معاملات میں فتویٰ دے۔

(۲) دوسرا شعبہ تعلیم کا ہے۔ جس کے ذمّے مذہبی تعلیم کی نگرانی ہے۔

(۳) تیسرا شعبہ وعظ و ارشاد ہے اور اس کے صدر کو رئیس الوعّاظ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

(۴) چوتھا شعبہ ملازمین کے تقرر، عزل و نصب کے لیے مخصوص ہے۔

یہ واضح رہے کہ یہ تمام ادارے ہندوستان کے قومی اداروں کی طرح نہیں ہیں۔ بلکہ انکا انتظام سرکاری دفاتر کی طرح نہایت منظم اور باقاعدہ ہے۔ اور وہ حکومت کے ایک محکمہ کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔

یوگوسلادیہ میں ہر مسلم پر مذہبی تعلیم لازم ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا گاؤں خواہ وہ پہاڑیوں ہی پر کیوں نہ آباد ہو مذہبی تعلیم سے محروم نہیں ہے۔ اس میں ضرور ابتدائی مدرسہ ہوتا ہے جہاں مسلمان بچوں کو قرآن کریم اور مذہبی مسائل کی تعلیم دی جاتی ہے۔

ابتدائی سرکاری مدارس میں بھی مذہبی تعلیم مسلمانوں کے لیے جبری ہے جس کی مدت دو سال ہے اور جس کا سرکاری پروگرام کے ماتحت انتظام کیا جاتا ہے مسلمان بچے جب اسلام کی ابتدائی تعلیم سے فارغ ہوتے ہیں تو انھیں سرکاری مدارس میں داخل کردیا جاتا ہے جن میں انھیں عربی زبان کی تعلیم و کتابت کے ساتھ جغرافیہ، حساب، تاریخ وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔

تعلیم کے سلسلے میں یہ واضح رہے کہ سرکاری مدارس میں مسلمان بچوں کے لیے معلّم یا ماسٹر بھی مسلمان ہی مقرر کیئے جاتے ہیں۔ اگر کسی سرکاری درسگاہ میں مسلمان کا ایک بچّہ بھی موجود ہے تو حکومت کا فرض ہوگا کہ اس کے لیے ایک مسلمان معلم کا بھی انتظام کرے! ظاہر ہے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت میں معلم کی سیرت، اس کے اخلاق و خیالات کو کتنا بڑا دخل حاصل ہے۔ اور یوگوسلادیہ کے مسلمان قابلِ تبریک ہیں کہ انھوں نے تعلیم کے شعبے کو اپنے قبضے میں رکھا ہے اور سرکاری مدارس میں بھی مسلمانوں کی خواہشات کا پورا احترام کیا جاتا ہے۔

یوگوسلادیہ میں جن مدارس کا تعلق حکومت سے نہیں ہے ان کے تعلیم یافتہ طلبہ کو بھی سرکاری ملازمتوں میں لیا جاتا ہے۔ یعنی غیر سرکاری اسلامی مدارس کی ڈگریاں سرکاری مدارس کی ڈگریوں کے مساوی سمجھی جاتی ہیں اور اسلامی مدارس کے طلبہ کو حکومت کے اعلیٰ مناصب اور عہدوں پر فائز کیا جاتا ہے۔

یوگوسلاویہ کے مسلمانوں کے لیے یہ بات قابلِ فخر ہے کہ ان کے تمام مذہبی اور شخصی معاملات خود ان ہی کے ہاتھ میں ہیں حکومت کو ان میں مداخلت کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ وہاں مسلمانوں کی اپنی شرعی عدالتیں قائم ہیں جن میں قاضی مسلمانوں کے باہمی معاملات کا فیصلہ قانون اسلامی کے مطابق کرتے ہیں اور حکومت کی طرف سے ان کا نفاذ ہوتا ہے۔ شرعی عدالتوں کے قاضیوں کا تقرر صدر مجلس علماء کے اختیار میں ہے۔ جب اس کی طرف سے قضاۃ کا تقرر ہو جاتا ہے تو وزیر عدالت اس کی تصدیق کرتا ہے اور یہ تمام قاضی گویا حکومت کی طرف سے جج تصور کیے جاتے ہیں۔ ان کا شمار بھی سرکاری ملازمین میں ہوتا ہے اور تنخواہ بھی انھیں حکومت کے خزانے سے ملتی ہے۔

یوگوسلاویہ کے حدود میں جس جگہ مسلمانوں کی تعداد پانچ ہزار ہے وہاں ایک شرعی عدالت قائم ہے اور سراجیفو اور اسکوپ میں عدالت عالیہ شرعیہ قائم ہے جس میں ماتحت شرعی عدالتوں کے فیصلوں پر نظر ثانی کی جاتی ہے اور اس کا فیصلہ آخری اور ناقابلِ تنسیخ سمجھا جاتا ہے۔ گویا یہ عدالت شرعی ہائیکورٹ ہے جہاں تمام مذہبی فیصلوں کی اپیل دائر کی جاتی ہے۔ شرعی عدالتوں کے لیے مسلمانوں کے اپنے مخصوص قوانین ہیں جو حکومت کی طرف سے منظور شدہ ہیں اور ان کے جملہ انتظامات کی نگرانی حکومت کی طرف سے کی جاتی ہے۔

یہ ہے یوگوسلاویہ میں حکومت در حکومت کا خاکہ جس میں مسلمانوں کو تہذیبی، شخصی اور مذہبی خود مختاری حاصل ہے۔ اور حکومت کو نگرانی کے سوا اس میں مداخلت کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

(زمزم)

یوگوسلیویا میں بین الاقوامی وفاق

سرب اور کروٹ قوموں کا تازہ معاہدہ

حال میں یوگوسلیویا کی دو بڑی قوموں، سرب اور کروٹ کے درمیان جو معاہدہ ہوا ہے وہ پتہ دیتا ہے کہ یورپ میں اب قلیل التعداد قوموں کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے ایک نئے طریق کار کا دروازہ کھل رہا ہے۔

اس معاہدہ سے پہلے سرب اکثریت ملک کی سیاسی زندگی پر بالکلیہ حاوی ہوگئی تھی۔ وہ ملک کی حکمراں قوم بنی ہوئی تھی، اور دوسرے تمام قلیل التعداد گروہوں کو اس نے محض "اقلیتوں" کی حیثیت دے رکھی تھی جو خود حکمرانی میں شریک نہیں ہوتیں بلکہ رعیت بن کر رہتی ہیں اور محض حکمراں قوم کے رحم وکرم پر زندگی بسر کرتی ہیں۔ مگر اب اس نئے معاہدہ کی رو سے کروٹ نہ تو اقلیت رہے ہیں، اور نہ ایک فرضی یوگوسلاوین قوم میں انکی ہستی کو گم شدہ قرار دیا گیا ہے، بلکہ اب سربی قوم نے یہ بات تسلیم کرلی ہے کہ سرب ایک قوم ہیں، اور کروٹ ایک دوسری قوم ہیں، اور یہ دونوں مل کر "یوگوسلاویا" نامی ایک اسٹیٹ بناتی ہیں جسکا مقصد دفاع ملکی اور بیرونی معاملات کی حد تک مشترک پالیسی پر عمل کرنا ہے، باقی رہے ان قوموں کے اپنے اندرونی معاملات، تو ان میں دونوں خود مختار ہیں۔ اس طرح یوگوسلیویا درحقیقت دو قوموں کا ایک وفاقی اسٹیٹ بن گیا ہے، جس میں موافقت کرنے والی دونوں قومیں اپنے اپنے حدود میں بالکل مستقل اور بااختیار ہیں، مگر بعض ایسے مرکزی مسائل میں جنکی صاف صاف تصریح کردی گئی ہے، مل کر معاملات کا انتظام وانصرام کرتی ہیں۔

سربیوں اور کروٹوں کے درمیان بہت کچھ مماثلت وہم جنسی پائی جاتی ہے۔ دونوں سلافی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں کی زبان قریب قریب ایک ہی ہے، صرف رسم الخط میں اختلاف ہے۔ ان کے لباس یکساں ہیں۔ ان کی معاشرتی رسمیں بہت ملتی جلتی ہیں۔ باہمی شادی بیاہ میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں۔ آپس میں مل کر کھاتے پیتے بھی ہیں۔ دونوں کے اخلاقی اصولوں اور جذبات وحسیات میں بھی چنداں فرق نہیں، کیونکہ دونوں عیسائی ہیں مزید برآں یہ دونوں قومیں ایک طویل مدت تک آسٹریا ہنگری اور ترکی سلطنتوں کی غلام رہی ہیں، اور ایک طویل مدت تک مل کر اپنی آزادی کے لیے جدوجہد کرتی رہی ہیں، جس کے دوران میں انکے مصائب بھی مشترک تھے اور مقاصد بھی مشترک تھے۔ مگر اسکے باوجود یہ دونوں مل کر ایک قوم نہ بن سکیں، اور ۲۱ سال کے تلخ تجربات کے بعد آخر کار انہیں تسلیم ہی کرنا پڑا کہ ہم ایک قوم نہیں بلکہ دو قومیں ہیں۔

اور یہ بات انہوں نے کس وقت تسلیم کی؟ ٹھیک اس وقت جبکہ یوگوسلیویا کو چاروں طرف سے حملہ کا خطرہ نظر آرہا ہے۔ ایک طرف اٹلی ہے جو البانیہ پر تسلط حاصل کر کے یوگوسلیویا کے سر پر پہنچ چکا ہے۔ دوسری طرف بلغاری، ہنگرین اور رومانوی اقلیتیں جو یوگوسلیویا میں آباد ہیں، انکی وجہ سے بلغاریا، ہنگری اور رومانیہ، تینوں ہمسایہ ریاستیں اس سے کم وبیش برسرِ پرخاش رہتی ہیں۔ تیسری طرف ۵ لاکھ جرمن اقلیت کی موجودگی ہٹلر کی طرف سے وہی مصیبت یوگوسلیویا پر ہر وقت لا سکتی ہے جو چیکوسلوواکیا اور پولینڈ پر نازل ہو چکی ہے۔ ان حالات میں توقع کی جا سکتی تھی کہ سربی اور کروٹ قومیں اور زیادہ ایک دوسرے سے قریب ہونگی، اور بالکل ہی ایک قوم بن کر رہ جائینگی۔ کیونکہ مشترک خطرات کا بھی قومیت بنانے میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ لیکن واقعات نے ثابت کر دیا کہ سربوں اور کروٹوں کے علحدگی پسند رجحانات کو نہ تو بیرونی خطرات دبا سکے، نہ اندرونی خطرات، اور نہ اشتراکِ نسل ووطن ہی انکو ایک قوم بنا سکا۔ کامل ۲۱ سال تک سربی اکثریت یہ کوشش کرتی رہی کہ ایک یوگوسلافی قومیت

پیدا ہو جائے، اور کروٹ قوم اپنے آپ کو اس قومیت میں گم کر دے۔ لیکن یہ کوشش جتنی زیادہ شدت اختیار کرتی گئی، اتنے ہی زیادہ حالات بگڑتے چلے گئے، یہاں تک کہ سربی اکثریت کو اُس وقت ہوش آیا جب اُسے واقعات کی رفتار سے اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ کروٹ قوم کو دبانے اور بلا شرکت غیرے مالک الملک بننے کی کوشش کا انجام بالآخر یہ ہو گا کہ ملک نہ سربیوں ہی کا رہیگا نہ کروٹوں کو مل سکے گا، بلکہ کسی اور طاقت ور ہمسایہ کے قبضہ میں چلا جائیگا۔ یہ غنیمت ہے کہ سربی قوم میں اگر کچھ انصاف پسند شریف لوگ نہیں تو کم از کم کچھ ہوشمند، صاحب بصیرت آدمی ہی موجود تھے جنہوں نے برے انجام کو آنے سے پہلے محسوس کر لیا، اور یوگوسلاوی نیشنلزم کا خرقۂ سالوسی اُتار کر سیدھی طرح سے یہ حقیقت تسلیم کر لی کہ سرب ایک قوم ہیں اور کروٹ دوسری قوم، اور ملک دونوں کا ہے۔

یوگوسلاویا کی آبادی ایک کروڑ ۴۰ لاکھ ہے جس میں سرب ۶۰ لاکھ ہیں اور کروٹ ۴۰ لاکھ باقی چالیس لاکھ میں بہت سی چھوٹی چھوٹی قومیں شامل ہیں جن میں سے کسی کی تعداد پانچ دس لاکھ سے زیادہ نہیں۔ اس طرح جہاں تک ملک کی مجموعی آبادی کا تعلق ہے، اس میں سربیوں کی اکثریت نہیں ہے، لیکن الگ الگ ہر قوم کے مقابلہ میں وہ کثیر التعداد ہیں۔ اسی صورت حال سے فائدہ اٹھا کر سربیوں نے حکمراں قوم بننے کی کوشش کی، اور عملاً تمام ملک پر اپنا اقتدار جما دیا۔ ان کے بعد دوسری طاقت ور قوم کروٹ تھے جنہوں نے اس غاصبانہ تسلط کی مخالفت کی۔ مگر سربی اخبارات اور سیاسی لیڈر یوگوسلاوی نیشنلزم کے نام پر ان کو ملامت کرتے، اور ان کو الزام دیتے رہے کہ یہ اپنی علحدگی پسندی سے "قومی مفاد" کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ سربیوں کا اقتدار چونکہ ملک پر چھایا ہوا تھا اسلیے خود کروٹ قوم میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے تھے جو "یوگوسلاوی نیشنلزم" کا دم بھرتے اور درحقیقت سربی نیشنلزم کی خدمت بجالاتے تھے۔ حکومت کی تمام عنایات ایسے ہی کروٹوں پر مبذول ہوتی تھیں۔ انتخاب مخلوط تھا، اسلیے زیادہ تر یہی کروٹ انتخابی اداروں میں منتخب ہو کر جاتے جن کو کروٹوں کی

بہ نسبت سربیوں کا اعتماد حاصل ہوتا۔ یہی لوگ مجلس او زرا میں بھی لیے جاتے تھے اور کروٹوں کو یہ کہکر فریب دیا جاتا تھا کہ دیکھو یہ "قومی" حکومت ہے، جس میں سرب اور کروٹ سب شامل ہیں۔ حالانکہ در اصل یہ کروٹ وزرا سربیوں کے ملازم ہوتے تھے نہ کہ ذمہ دار وزرا۔ اس کے ساتھ ہی سربی اکثریت نے تعلیم اور اقتدار حکومت اور معاشی طاقت سے کام لے کر ایک زبردست مہم اس غرض کے لیے شروع کر رکھی تھی کہ خود کروٹوں کے خیالات بدلے جائیں اور انکی رائے عام کو اتنا متأثر کر دیا جائے کہ آئندہ سے کروٹوں ہی کے ووٹوں سے وہ لوگ منتخب ہونے لگیں جو سربیوں کے لیے مفید مطلب ہوں۔ کروٹ قوم کے تعلیم یافتہ، ذی شعور لوگ ان کوششوں کو سب سے زیادہ خطرے کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ سربیوں کا اندرونی نفوذ جتنا زیادہ بڑھتا جاتا تھا، اتنا ہی زیادہ کروٹ قوم پرستوں میں یہ میلان بڑھتا چلا جارہا تھا کہ کسی بیرونی طاقت، مثلاً اٹلی یا جرمنی کی مدد سے سربیوں کی سرکوبی کرائیں، اور ان کے عنکبوتی استیلاء سے نجات حاصل کریں۔

ان حالات میں کروٹ قوم کے لیڈر ڈاکٹر ماچک (Matchek) نے یہ آواز اٹھائی کہ "اگر یوگوسلیویا کو ایک مستقل اسٹیٹ کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے، تو اسے کروٹیا، مقدونیا، مانٹی نیگرو اور سربیا کے ممالک متحدہ میں تبدیل ہونا پڑیگا"۔ ایک مدت تک اسکی آواز بہرے کانوں سے سنی جاتی رہی۔ مگر چیکوسلوواکیا کا حشر دیکھنے کے بعد سربیوں کے خیالات روباصلاح ہونے لگے۔ انکو واقعی خطرہ ہوگیا کہ کروٹوں کی بے اطمینانی ایک روز یوگوسلاویا کی آزادی کو ختم کرا دیگی۔ آخر کار ۲؍ اپریل ۱۹۳۹ء کو تاج کی طرف سے رئیس او زراء خود ڈاکٹر ماچک سے گفتگو کرنے کے لیے زاگرب گیا۔ ملاقات سے پہلے یہ بات طے ہوگئی تھی کہ دونوں لیڈر مساویانہ حیثیت سے ملینگے، گویا کہ وہ دو مستقل قوموں کے نمائندے ہیں۔ ۲۵ دن کے اندر ان دونوں نے ۲۱ سال کے اختلافات کو صاف کر دیا اور ۲۷؍ اپریل کو اعلان ہوگیا کہ ان کے درمیان ایک اطمینان بخش سمجھوتہ ہوچکا ہے۔

اس سمجھوتہ کی رو سے کروٹیا (وہ علاقہ جہاں کروٹوں کی اکثریت ہے) یوگوسلاویا کے اندر ایک آزاد علاقہ تسلیم کیا گیا ہے جسکی پارلیمنٹ اور حکومت اپنی ہوگی اور جسکو اپنے اندرونی معاملات کا انتظام کرنے کے لیے پورے اختیارات حاصل ہونگے۔ کروٹیا ایک جداگانہ اسٹیٹ سمجھا جائیگا اور اسکے باشندوں کو ایک جداگانہ قوم کی حیثیت حاصل ہوگی۔ یوگوسلاویا کے باقی حصوں کے ساتھ مل کر کروٹیا اُس فرمانروا خاندان کی سیادت تسلیم کریگا جو اس وقت یوگوسلاویا کے تخت کا مالک ہے۔ فوج مشترک ہوگی اور امورِ خارجیہ کا تعلق بھی مرکزی حکومت سے ہوگا۔ اس سمجھوتے کے اہم نکات حسب ذیل ہیں:-

۱- یوگوسلاویا کی ریاست اب سرب اور کروٹ، دو قوموں کی وفاقی ریاست قرار پائی ہے باقی چھوٹی چھوٹی قومیں جو وہاں آباد ہیں، انہیں اقلیتوں کی حیثیت دی گئی ہے۔

۲- جس علاقہ میں کروٹ کثرت سے آباد ہیں وہاں کروٹوں ہی کا اسٹیٹ ہے، اور جہاں سربیوں کی اکثریت ہے وہاں سربیوں کا اسٹیٹ ہے لیکن کروٹ اسٹیٹ میں قلیل التعداد سربیوں کے لیے، اور سربی اسٹیٹ میں قلیل التعداد کروٹوں کے لیے تحفظات رکھے گئے ہیں۔

۳- انتخابی حلقے اسطرح بنائے گئے ہیں کہ سرب کروٹوں کو یا کروٹ سربیوں کو نمائندگی سے محروم نہ کرسکیں۔

۴- مرکزی حکومت میں سربی اور کروٹ وزراء کی تعداد مساوی رکھی گئی ہے۔ اور وزارتِ عظمیٰ کیساتھ ایک نائب وزیر اعظم کا عہدہ رکھا گیا ہے۔ باری باری ایک مرتبہ سربی قوم کا آدمی وزیر اعظم ہوگا تو کروٹ قوم کا آدمی اس کا نائب ہوگا، اور دوسری مرتبہ کروٹ قوم کا آدمی وزیر اعظم ہوگا تو سربی قوم کا آدمی اسکا نائب۔

۵- فوج کے متعلق طے ہوا ہے کہ دونوں قوموں کے آدمی اس میں بلا امتیاز لیے جائینگے۔ کنٹرول مشترک ہوگا جدھر سربیوں کا علاقہ ہے ادھر کی سرحدوں پر سربی فوجیں مامور ہونگی اور جدھر کروٹوں کا علاقہ ہے اس طرف کی سرحدوں کی حفاظت کروٹ فوجیں کرینگی۔ ۶- یوگوسلاویا کی مرکزی پارلیمنٹ کا دائرۂ عمل اب صرف دفاع، امورِ خارجیہ اور چند دوسرے مرکزی معاملات سے ہے جن کی تعیین کے ساتھ صراحت کردی گئی ہے۔

۷- مرکزی حکومت کی ملازمت میں سرب اور کروٹ دونوں اپنی اپنی آبادی کے تناسب سے لیے جائینگے۔

(ایسٹرن ٹائمز)

مطبوعات

کرسینٹ فروغ اردو نمبر اسلامیہ کالج لاہور کے چند حساس اور علم دوست مسلم طلبہ نے ادب اردو کی خدمت کرنے کے لیے "بزم فروغ اردو" کے نام سے ایک مجلس قائم کر رکھی ہے جس کے اجلاسوں میں وہ تیاری کر کے اپنے مقالات پڑھتے ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے ان کے سال بھر کے مقالات کا تیسرا مجموعہ ہے، جس کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں، موجودہ زہریلی فضا اور ناقص تربیت کے باوجود، ایسے سلیم مذاق اور بلند نظر رکھنے والے افراد موجود ہیں جو اپنی "علمی خودی" کا احساس رکھتے ہیں اور بلند پایہ اور ٹھوس علمی مضامین لکھنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس نمبر میں متعدد مقالات ایسے ہیں جنھیں دیکھ کر مقالہ نگاروں کے شاندار مستقبل کے بارے میں پر اُمید پیش گوئیاں کی جا سکتی ہیں۔ ارکان بزم اور مرتبین رسالہ اپنی اس کامیاب کوشش پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ امید ہے کہ دوسرے طلبہ بھی ان کے عمل سے سبق لیں گے۔

جوہر اقبال مرتبہ محمد حسنین سید صاحب متعلم بی۔ اے۔ ناشر مکتبہ جامعہ دہلی۔ ضخامت سوا دو سو صفحات۔

"انجمن اتحاد" نے، جو جامعہ ملیہ دہلی کے طلبہ کی ایک انجمن ہے، علامہ اقبال مرحوم کی یادگار میں "جوہر" کا یہ شمارہ خصوصی نکالا ہے۔ جو ظاہری اور معنوی ہر طرح کی خوبیوں سے مزین ہے ابتدا میں مشاہیر ملک کے بیانات درج ہیں۔ اس کے بعد مقالات اور نظموں کا سلسلہ

اور نظموں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ مقالہ نگاروں میں متعلمین جامعہ کے علاوہ وقت کے بہت سے مشہور اہل قلم بھی شامل ہیں۔ یہ مجموعہ اپنی جامعیت کے لحاظ سے "اقبال" پر گویا ایک مکمل تبصرہ ہے جس میں مختلف ارباب قلم نے اس کی تعلیم نیز اس کی سیرت کا ایک ایک رخ نمایاں کر دیا ہے۔ اقبال کو سمجھنے کے لیے یہ مجموعہ ناظرین کے لیے مفید ثابت ہوگا۔

اقبال کے متعلق نیم پختہ دماغوں میں ایک عجیب غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔ اکثر مضامین ایسے دیکھنے میں آتے رہتے ہیں ــــ اور اس مجموعہ میں بھی ایسے خیالات جھلکتے دکھائی دے رہے ہیں ــــ کہ اقبال کو ملی شاعر یا شاعر اسلام کہنا غلط ہے، وہ شاعرِ انسانیت تھا اور اس کی وسعت نگاہ اور فراخیٔ دل کسی خاص شرع یا مذہب کے تنگ حلقہ کی اسیری قبول نہیں کر سکتی تھی۔ اس خیال کے ظاہر کرنے والے یا تو اسلام کو نہیں سمجھتے یا پھر وہ اقبال ہی کو نہیں سمجھتے۔ اقبال یقیناً شاعرِ انسانیت تھا لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام بھی مذہب انسانیت ہی ہے۔ جس طرح رنگ، نسل، وطن اور قوم کی مادی قیود سے اس کی نظر آزاد اسی طرح اُس کی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کو یہ وسعتِ نگاہ اور فراخیٔ قلب خود اسلام ہی کے طفیل ملی اور اسے اس کا اعتراف ہے۔

نیا ادب | مرتبہ سبط حسن صاحب۔ ضخامت ۷۰ صفحات، شرح چندہ تین روپیہ سالانہ ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ "نیا ادب" نظیر آباد۔ لکھنؤ۔

یہ ایک ادبی رسالہ ہے جو "ترقی پسند مصنفین" کی ادارت اور سرپرستی میں شائع ہوتا ہے۔ مضامین زیادہ تر انقلابی افسانوں پر مشتمل ہوتے ہیں جن میں ضروریات زندگی سے متعلق بحث ہوتی ہے اور موجودہ نظام معیشت و معاشرت کے خلاف باغیانہ احتجاج کیا جاتا ہے۔ رسالہ کی زبان بھی سلیس اور سادہ ہوتی ہے اور غالباً انھیں دونوں وجوہ

کی بنا پر اس کا نام "نیا ادب" رکھا گیا ہے۔

"ترقی پسند مصنفین" کی اصطلاح کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ ایک مخصوص بولی میں ترقی پسند مصنف وہ کہلاتا ہے جو کمیونسٹ خیالات و نظریات کا قائل و ترجمان ہو، دنیا کے ہر مسئلہ پر، پیٹ کے مسئلہ کو مرکز مان کر رائے زنی کرے، اور ہر گفتگو کی ابتدا مزدور اور کسان کے لفظ سے کرے۔ اس میں شبہ نہیں کہ موجودہ معاشرتی خرابیوں اور معاشی بے انصافیوں کے خلاف آواز اٹھانی چاہیے، نیز ادب کو زندگی کا ترجمان اور خادم ہونا چاہیے مگر بھولنا نہ چاہیے کہ ہر حرکت کے لیے ایک مخصوص حد ہوتی ہے جب وہ اس حد سے آگے قدم رکھے گی تو خیر کے بجائے شر بن جائے گی۔ انقلاب کا خیر مقدم کرنا چاہیے مگر اس کی تخریبی فطرت کا لحاظ رکھ کر۔

تاریخ اخلاق اسلامی حصہ اول | تالیف مولانا عبدالسلام ندوی۔ ضخامت ۲۷۴ صفحات۔ قیمت عہ دار المصنفین۔ اعظم گڈھ۔

دار المصنفین نے علوم اسلامی کی جو زرین خدمات گذشتہ ۲۰ سال میں انجام دی ہیں، ان میں ایک تازہ اضافہ اس کتاب کی تالیف و اشاعت بھی ہے۔ اسلامی اخلاق کی کوئی مرتب تاریخ اب تک غالباً خود عربی زبان میں بھی نہیں لکھی گئی۔ یہ پہلا قدم ہے جو اس راہ میں اٹھایا گیا ہے، اور اردو زبان خوش قسمت ہے کہ اس کے ادب میں ایسی ایک بیش قیمت چیز کا اضافہ ہوا۔

زیر تبصرہ کتاب اس سلسلہ کی صرف پہلی جلد ہے جس میں عرب جاہلیت اور روم و عجم کے اخلاقیات کو مختصراً بیان کرنے کے بعد قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات کو تفصیل کے ساتھ مختلف عنوانات کے تحت بیان کیا گیا ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان تعلیمات کا اہل عرب کی زندگی پر کیا اثر ہوا۔ فاضل مولف نے اپنے مقدمہ میں ارادہ ظاہر کیا ہے کہ بعد کی جلدوں میں

وہ خلافت راشدہ، بنی امیہ، بنی عباس اور بعد کے زمانوں کی اخلاقی تاریخ بھی اسی طرز پر مرتب کرینگے۔

چونکہ یہ اس راہ میں پہلی کوشش ہے اس لیے اس میں کوتاہیوں کا پایا جانا کوئی قابلِ تعجب بات نہیں۔ ابتدائی کوششیں عموماً ناقص ہی ہوتی ہیں۔ ان کی اصلی خدمت یہی ہوتی ہے کہ ان سے بعد کے کام کرنے والوں کے لیے راستہ صاف ہوجاتا ہے اور بہت سا خام مواد وہ بعد کے معماروں کے لیے فراہم کردیتی ہیں۔ اس لحاظ سے ہم اس کتاب کی قدر کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی اس کی بعض نمایاں کمزوریوں کی طرف اشارہ بھی کردیتے ہیں۔

اس کتاب کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولف کے سامنے اپنے موضوع کا کوئی صحیح تصوّر موجود نہیں ہے بلکہ مختلف قسم کے مبہم تصورات انکے ذہن میں باہم مختلط ہوگئے ہیں۔ جیسا کہ انہوں نے اپنے دیباچہ میں بیان کیا ہے، ان کو لیکی کی تاریخ اخلاق یورپ دیکھ کر تاریخ اخلاق اسلامی لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ اسی چیز نے دراصل ان کی غلط رہنمائی کی ہے۔ انہوں نے خیال کیا کہ ان کا کام بھی لیکی کے کام سے ملتا جلتا ہے۔ اُس نے یورپین اقوام کے اخلاقیات کی تاریخ لکھی ہے۔ یہ اس کے جواب میں مسلمان نامی ایک قوم کے اخلاق کی تاریخ لکھ دیں۔ حالانکہ دونوں کے موضوع اصولی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ لیکی کے سامنے ایک خاص سرزمین کے باشندے تھے، اور اسے یہ بتانا تھا کہ ان لوگوں کی زندگی پر مختلف اخلاقی فلسفوں نے کیا اثرات ڈالے۔ بخلاف اس کے تاریخ اخلاق اسلامی لکھنے والے کے سامنے کوئی قوم نہیں ہے بلکہ اس کے سامنے دراصل تعمیر انسانیت کی ایک تحریک ہے جو اپنے مخصوص اخلاقی فلسفہ پر ایک نظام تہذیب کی بنیاد اٹھانا چاہتی ہے، لہٰذا اس کو سب سے پہلے اس تحریک کی اخلاقی روح، اس کا فلسفہ، اور اسکے اصول پیش کرنے چاہئیں تاکہ ناظر کے سامنے اس کی پوری تصویر آجائے، پھر یہ بتانا چاہیے کہ جن لوگوں نے اس تحریک کو قبول کیا انکی زندگی کا نقشہ اس نے کس طرح بنایا، اپنے اصولوں کو زندگی کے جزئی و تفصیلی معاملات میں کس

طرح جاری کیا، اور اس وقت کے ذہنی، تمدنی، معاشی اور سیاسی حالات میں اپنی روح کو کن کن طریقوں سے داخل کیا۔ اس کے بعد اسے یہ دکھانا چاہیے کہ اس تحریک کے زیر اثر آنیوالے لوگ، جو اسی حیثیت سے مسلمان کہلاتے ہیں، تاریخ کے دوران میں کن کن تغیرات سے گذرے ہیں۔ اُن کی زندگی جو ابتداءً بالکلیہ اس تحریک کی مظہر تھی، بعد کے ادوار میں کس طرح اور کس تدریج کے ساتھ دوسرے اخلاقی تصورات سے متاثر ہوتی رہی، اور اس مرکب زندگی میں اسلامی اثر اور غیر اسلامی اثرات کے مظاہر کس طرح ایک دوسرے سے ممیز ہوتے ہیں۔ غرض یہ کہ تاریخ اخلاق اسلامی کے مصنف کو دراصل ایک تحریک کی تاریخ لکھنی ہے، نہ کہ ایک قوم کی۔ اگر اسکا موضوع یہ نہیں ہے تو اسے اپنی کتاب کا نام بدل کر تاریخ اخلاق مسلمین رکھنا چاہیے۔

اپنے موضوع کا واضح تصور سامنے نہ رکھنے ہی کی وجہ سے مولف نے کتاب کا آغاز اخلاقِ عرب قبل اسلام کے ذکر سے کیا ہے، اور ضمناً روم و ایران کی اخلاقی حالت بیان کرکے قرآن کی اخلاقی ہدایات مفصلاً نقل کرنی شروع کردی ہیں۔ اگر وہ یہ سمجھ لیتے کہ انہیں دراصل ایک تحریک کی تاریخ لکھنی ہے تو وہ اُن مختلف اخلاقی فلسفوں اور اخلاقی تصورات پر اصولی بحث کرتے جو دنیا میں اس وقت پائے جاتے تھے، اور یہ بتاتے کہ اسلامی تحریک اپنی اسپرٹ، اپنے تصورِ اخلاق، اور اپنے اصول میں اُن سے کس طرح ممیز ہوتی ہے، اور ہر ایک کے عملی مظاہر کس طرح ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اسی سے ملتی جلتی غلطی یہ بھی ہے کہ اسلام کے اصول اخلاق اور اسکی تعلیمات کے مقابل میں محض عرب جاہلیت یا روم و ایران کی اس عملی حالت کو پیش کرنے پر اکتفا کیا گیا جو ظہور تحریک اسلامی کے وقت پائی جاتی تھی۔ اس کا فائدہ صرف اتنا ہی ہے کہ پڑھنے والے کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ جب اسلام ظاہر ہوا تو لوگوں کی کیا حالت تھی اور اسلام نے انہیں کیا بنا دیا۔ مگر اصلی تقابل اصول کا اصول سے، تصورات کا تصورات سے اور فلسفہ کا فلسفہ سے ہے نہ کہ عام لوگوں کی عملی حالت سے۔ لہٰذا ایک تحریک کی تاریخ لکھنے والے کے لیے ضروری ہے کہ ان اخلاقی معیارات کو مقابلہ میں پیش کرے جن پر اس تحریک کے ظہور کے وقت عوام اور خواص بحیثیت مجموعی اعتقاد رکھتے تھے۔

اس کتاب کی یہ چند بنیادی کمزوریاں اس لیے بیان کردی گئی ہیں کہ جناب مؤلف خود، یا انکے بعد جو لوگ آئندہ اس موضوع پر قلم اٹھائیں وہ ان کا لحاظ رکھیں۔ اور اہل بصیرت ناظرین اس کا مطالعہ ایسی توقعات کیساتھ نہ کریں جنہیں یہ کتاب پورا نہیں کرسکتی۔ لیکن ان کمزوریوں کے باوجود اس میں ایسا مواد موجود ہے کہ جو شخص انصاف کی نظر سے اسکو دیکھے گا اس کے دل پر اسلامی اخلاق کی بزرگی، جامعیت، اور شانِ توازن و اعتدال کا نقش مرتسم ہو جائیگا۔

الجہاد فی الاسلام

دورِ جدید میں یورپ نے اپنی سیاسی اغراض کیلیے اسلام پر جو بہتان تراشے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے۔ اور اپنے پیرووں کو خونریزی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس بہتان کی اگر کچھ حقیقت ہوتی تو قدرتی طور پر اسے اس وقت پیش ہونا چاہیے تھا۔ جبکہ پیروانِ اسلام کی شمشیرِ خاراشگاف نے کرۂ زمین میں ایک تہلکہ برپا کر رکھا تھا۔ اور فی الواقع دنیا کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید ان کے یہ فاتحانہ اقدامات کسی خونریز تعلیم کا نتیجہ ہوں۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس بہتان کی پیدائش آفتاب عروجِ اسلام کے غروب ہونے کے بہت عرصہ بعد عمل میں آئی۔ اور اسکے خیالی پتلے میں اس وقت روح پھونکی گئی جبکہ اسلام کی تلوار تو زنگ کھا چکی تھی۔ مگر خود اسکے موجد یورپ کی تلوار بیگناہوں کے خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ اور اس نے دنیا کی کمزور قوموں کو اس طرح نگلنا شروع کر دیا تھا جیسے کوئی اژدھا چھوٹے چھوٹے جانوروں کو ڈستا اور نگلتا ہو۔ اگر دنیا میں عقل ہوتی۔ تو وہ سوال کرتی کہ جو لوگ خود امن و امان کے سب سے بڑے دشمن ہوں، جنھوں نے خود خون بہا بہا کر زمین کے چہرہ کو رنگین کر دیا ہو اور جو خود قوموں کے چین و آرام پر ڈاکے ڈال رہے ہوں، انہیں کیا حق ہے کہ اسلام پر وہ الزام عائد کریں جسکی فردِ جرم خود ان پر لگنی چاہیے؟ کیا اس تمام مورخانہ تحقیق و تفتیش اور عالمانہ بحث و اکتشاف سے انکا یہ منشا تو نہیں کہ دنیا کی اس نفرت و نارضی کے سیلاب کا رخ اسلام کیطرف پھیر دیں۔ جسکی خود انکی اپنی خونریزیوں کے خلاف امنڈ کر آنیکا اندیشہ ہے؟ لیکن انسان کی یہ کچھ فطری کمزوری ہے کہ وہ جب میدان میں مغلوب ہوتا ہے تو مدرسہ میں بھی مغلوب ہو جاتا ہے۔ جسکی تلوار سے شکست کھاتا ہے اس کے قلم کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا، اور اسی لیے ہر عہد میں دنیا پر انہی افکار و آراء کا غلبہ رہتا ہے جو تلوار بند ہاتھوں کے قلم سے پیش کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ میں بھی دنیا کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے میں یورپ کو پوری کامیابی ہوئی۔ اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والی قوموں نے اسلامی جہاد کے متعلق اسکے پیش کردہ نظریہ کو بلا ادنیٰ تحقیق و تفحص اور بلا ادنیٰ غور و خوض اس طرح قبول کر لیا کہ کسی آسمانی وحی کو بھی اس طرح قبول نہ کیا ہوگا۔

پس اگر آپ اسلامی جہاد کی حقیقت اور اسکے متعلقہ مسائل سے کماحقہ واقف ہونا چاہتے ہیں تو الجہاد فی الاسلام کا مطالعہ فرمائیے۔ اسلامی لٹریچر میں اس موضوع پر شروع اسلام سے اب تک اس پایہ کی کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔

ضخامت ۵۰۰ صفحات قیمت بے جلد چار روپے مجلد پانچ روپے۔

دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجئے۔

بقیہ مضمون صفحہ ۱۱۱ۃ۔ ذات پر کیا اثر پڑتا ہے، اور یہ کہ میں اس صورت حال میں اپنے لیے کس طرح فائدہ حاصل کرسکتا ہوں، تو پھر "مسلمان" کے نام سے میرے الگ وجود کی کوئی وجہ باقی ہی نہیں رہتی۔ ایسا طرزِ عمل تو اگر میں نامسلمان ہوتا اور کسی آسمانی کتاب کی مجھے ہوا بھی نہ لگی ہوتی تب بھی میں اختیار کرسکتا تھا۔

میں اس معاملہ کو ہندوستانی وطن پرست کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتا۔ مجھے اس سے بھی کوئی بحث نہیں کہ سیاسی حیثیت سے مسلم لیگ کی یہ پالیسی مسلمان نام کی اُس قوم کے لیے، جو ہندوستان میں بستی ہے، مفید ہوگی یا مضر۔ میرے لیے جو سوال اہمیت رکھتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جو قوم اس وقت مسلمان کے نام سے پکارے جانے کے باعث دنیا میں اسلام کی نمائندہ سمجھی جاتی ہے، اس کی سب سے بڑی مجلس نے دنیا کے سامنے اسلام کو کس رنگ میں پیش کیا ہے؟ اس نقطۂ نظر سے جب میں مسلم لیگ کے ریزولیوشن کو دیکھتا ہوں تو میری روح بے اختیار ماتم کرنے لگتی ہے۔ ان لوگوں کو ایک موقع، اور نادر موقع ملا تھا کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا کی ساری قوموں پر اپنے اخلاقی مرتبہ کی برتری کا سکہ جما دیتے۔ ان کو ایک بیش قیمت موقع ملا تھا اس حقیقت کے اظہار کا کہ ہم ایک اخلاقی اصول کے پیروکار ہیں، اور وہ اخلاقی اصول حق اور عدل کی پاک ترین روح کا حامل ہے، اور دنیا میں صرف ہماری جماعت ہی وہ ایک جماعت ہے جو شخصی یا قومی نفع و نقصان کے تصورات سے بالاتر ہو کر مجرد اخلاق کی بنیاد پر کام کرتی ہے۔ اگر لیگ کے رہنماؤں میں اسلامی حس کا شائبہ بھی موجود ہوتا تو وہ اس موقع کو ہاتھ سے نہ دیتے۔ اور اس کا جو گہرا اخلاقی اثر مترتب ہوتا، اُس کی قدر و قیمت کے مقابلہ میں کوئی نقصان جو

ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے کی وجہ سے ہم کو پہنچنے کا اندیشہ تھا، اور کوئی فائدہ جو اُس کے برعکس طرزِ عمل اختیار کرنے کی وجہ سے حاصل ہونے کی توقع ہے، قطعاً کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ مگر افسوس کہ لیگ کے قائدِ اعظم سے لے کر چھوٹے قائدوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو، اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو۔ یہ لوگ مسلمان کے معنی و مفہوم اور اس کی مخصوص حیثیت کو بالکل نہیں جانتے۔ ان کی نگاہ میں مسلمان بھی ویسی ہی ایک قوم ہیں جیسی دنیا میں دوسری اور قومیں ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہر ممکن سیاسی چال اور ہر مفید مطلب سیاسی تدبیر سے اس قوم کے مفاد کی حفاظت کر دینا ہی بس "اسلامی سیاست" ہے ـــــ حالانکہ ایسی ادنیٰ درجہ کی سیاست کو اسلامی سیاست کہنا اسلام کے لیے ازالۂ حیثیتِ عرفی سے کم نہیں!

"مسلمانوں" کی زندگی کے مختلف شعبوں اور مختلف پہلوؤں سے یہ چند مثالیں جو میں نے پیش کی ہیں، یہ سب ایک ہی نتیجہ کی طرف رہنمائی کر رہی ہیں، اور وہ یہ ہے کہ اسلامی تحریک اِس وقت تنزل و انحطاط کے اُس آخری مرحلہ پر پہنچ گئی ہے جہاں ایک تحریک کی روح ناپید ہو جاتی ہے، صرف اس کا نام باقی رہ جاتا ہے، اور اس نام کا اطلاق برعکس نہند نام زنگی کافور کے بمصداق، اُن چیزوں پر ہونے لگتا ہے جو اس کے اصل معنی کی ضد ہوتی ہیں۔ نظریات غیر اسلامی اور نام ان کا مسلمان۔ مقاصد غیر اسلامی اور ان کا نام بھی مسلمان۔ سیرت غیر اسلامی اور اس پر بھی لفظ مسلمان چسپاں۔ رویّہ غیر اسلامی اور اس پر بھی لفظ مسلمان کا بے تکلف اطلاق۔ افراد سے لے کر جماعتوں تک، سوسائٹی کے ادنیٰ ترین طبقوں سے لے کر بلند ترین طبقوں تک، چھوٹی انجمنوں سے لے کر بڑی سے

بڑی مجلسوں تک، ہر طرف اسی ایک وبائے عام کے اثرات پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میرے دل نے بارہا یہ سوال کیا ہے کہ اسلام جو کبھی آندھی اور طوفان کی طرح اٹھا تھا، جس کے سامنے دنیا کی کوئی طاقت نہ ٹھیر سکتی تھی، آج اس کی کشور کشائی و عالمگیری آخر کس چیز نے چھین لی؟ اس کا جواب ہر بار مجھے یہی ملا کہ اسلامی تحریک پر تنزل و انحطاط کے اُسی قانون کا عمل جاری ہوا ہے جسے میں ابتدا میں بیان کر آیا ہوں۔ اب اصلاح کی صورت اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسلام کو از سر نو ایک تحریک کی حیثیت سے اٹھایا جائے اور مسلم کے معنی کو پھر سے تازہ کیا جائے۔ مُردوں کی اس بستی میں جو تھوڑے بہت مسلمان دل ابھی حرکت کر رہے ہیں، اور جن کی گہرائیوں سے ابھی تک یہ شہادت بلند ہو رہی ہے کہ اسلام ہی حق اور صدق ہے اور انسانیت کی فلاح صرف طریق اسلامی ہی میں ہے، ان کو جان لینا چاہیے کہ اب کرنے کا کام یہی ہے ــــــ مگر اس کام کو کرنا کھیل نہیں ہے۔ یہ وہ کوہ کنی ہے جس کے تصور ہی سے فرہاد کا زہرہ آب ہو جاتا ہے۔

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

حصہ اول

اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالت اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ جس سے مسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے

حصہ دوم

اس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کر کے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت سے اس وقت تک ملک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصول اسلام اور مسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔ اس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے۔

حصہ سوم

مسلمانوں کی موجودہ سیاسی کشمکش کا عملی حل کیا ہے۔ اسلامی حکومت کن اصولوں پر قائم کی جا سکتی ہے۔ ایسا اقدام کرنے والے گروہ کو کن اصولوں پر منظم کیا جا سکتا ہے، اور ان اصولوں پر جس قدر اعتراضات و شبہات کئے جا سکتے ہیں، ان کا جواب کیا ہے۔ یہ تمام باتیں اس حصہ میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دی گئی ہیں۔

قیمت حصہ اول	حصہ دوم	حصہ سوم	محصول ڈاک
آٹھ آنے فی جلد	ایک روپیہ آٹھ آنے	ایک روپیہ چار آنے	تین آنے

دفتر رسالہ ترجمان القرآن دار الاسلام، پٹھانکوٹ، (پنجاب)

مدیر ترجمان القرآن کی تالیفات

الجہاد فی الاسلام

مختصر فہرست مضامین حسبِ ذیل ہے :-

۱- اسلامی جہاد کی حقیقت۔ اسمیں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیمِ جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظامِ تمدن میں رُوحِ جہاد کا کیا مرتبہ ہے

۲- مدافعانہ جنگ۔ وہ اغراض جن کے لئے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔

۳- مصلحانہ جنگ۔ اصلاحی جنگ کے اصُول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں۔

۴- اشاعت اسلام اور تلوار۔ دعوت و تبلیغ کے متعلق اصُول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس امر کی تحقیق کہ اشاعتِ اسلام میں تلوار کا کیا حِصّہ ہے۔

۵- قوانینِ جنگ۔ اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور اُن میں اسلام کی اصلاحات۔

۶- جنگ دُوسرے مذاہب میں۔ جنگ کے متعلق ہندو مذہب، بودھ مت، یہودیت اور مسیحیت کی تعلیمات پر مفصل تبصرہ۔

۷- جنگ اور تہذیب جدید۔ بین الاقوامی قانونِ جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون سے اسکا مقابلہ۔ قیمت مجلد ۵؍ غیر مجلد ۴؍

رسالہ دینیات

یہ رسالہ ہائی اسکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے لکھا گیا ہے۔ اس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید طرز اختیار کیا گیا ہے۔ مُسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے۔ اسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصُولِ شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانۂ جدید کے دماغوں میں عمُوماً پیدا ہوتے ہیں۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اس رسالہ کا مُطالعہ فائدہ سے خالی نہیں نیز علماء بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے۔

قیمت ۱۰؍ محصُول ڈاک ۲؍ خرچ وی پی ۳؍

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجیے

سوسائٹی و تصاویر پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع ہوئے